۱

معیاری تخلیقات کی ایک اہم دستاویز

خصوصی شمارہ

قمر جمالی کے افسانے

تناظر دہلی

خصوصی

پیشکش

افسانوی انتخاب

مدیر ناشر اور طابع

بلراج ورما

قیمت ۴۰ روپے

طباعت سپر پرنٹرز ساؤتھ انارکلی، دہلی۔ ۵۱

پرنٹر پبلشر

پتہ تناظر نئی دہلی پبلی کیشنز

۲۴ ڈی۔ پاکٹ ۳۔ میور وہار۔ دہلی ۹۱ فون ۲۲۵۲۳۱۹

• اکادمی کی مطبوعات •

۱۹۸۶ء کی مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
1	دہلی کی آخری شمع۔	23
2	دلی والے (جلد اول)۔	36
3	دلی کا آخری دیدار۔	17
4	قلعۂ معلی کی جھلکیاں۔	17
5	رسوم دہلی۔	38
6	مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے	39
7	بزم آخر	21
8	داغ دہلوی	31

۱۹۸۷ کی مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
	سوانح دہلی۔	17
10	خواجہ حسن نظامی، حیات اور کارنامے	29
11	عالم میں انتخاب دہلی۔	53
12	دلی کی تہذیب۔	17
13	دیوان حالی۔	24
14	چراغ دہلی۔	39
15	اردو صحافت۔	32
16	دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل	23
17	نوبت پنج روزہ یعنی وداع ظفر۔	23
18	دلی کی آخری بہار۔	20
19	لال قلعہ کی ایک جھلک۔	21
20	ذاکر کری اور ناشرین و تاجران کتب	50
21	اردو غزل۔	31
22	اردو مشترکہ ہندوستانی تہذیب	39
23	مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب	31

۱۹۸۸ کی مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
		60
24	سب اردو افسانہ تجزیہ اور مباحثہ	60
25	انتخاب کلام داغ۔	34
26	دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات	21
	دہلی اور اس کے اطراف	25

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
28	حواشی ابوالکلام آزاد۔	62
29	اردو میں بارہ ماسے کی روایت۔	49
30	دلی کی درگاہ شاہ مرداں۔	33
31	دلی والے (جلد دوم)۔	56
32	دلی کے آثار قدیمہ۔	48
33	اشاریہ آج کل۔	77

۱۹۸۹ کی مطبوعات۔

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
34	دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر	26
35	مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین	47
36	آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل	61
37	رنگ ہزاروں خوشبو ایک	28
38	کلیات مکاتیب اقبال (جلد اول)	170
39	نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس	30
40	انشا، ہادی النساء مع تحر النساء۔	22

۱۹۹۰ کی مطبوعات۔

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
41	واقعات دار الحکومت دہلی (تین جلدیں)	400
42	آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ۔	48
43	آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم۔	48
44	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق۔	48
45	آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح۔	44
46	آثار الصنادید (تین جلدیں)	310
47	فوائد الفوائد۔	88
48	آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ	64
49	آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید۔	70
50	آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ۔	45
51	مہربان جن۔	25
52	اردو مرثیہ۔	67
53	[illegible]	80
54	آدمی نامہ	40
55	[illegible]	16

تناظر

(اُردو اینتھالوجی) کا یہ شمارہ

تخلیق : قُرّۃُ العین حیدر صاحبہ

تنقید : پروفیسر گوپی چند نارنگ

اور

تحقیق : مالک رام صاحب

کی نذر ہے

فہرست

ترتیب : شامِ یاراں

گلدیپ گوہر

شعری وافسانوی انتخاب

از منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی
سن پیدائش ۱۸۷۲ء سن وفات ۱۹۱۰ء

ادائے شرم

یہ نگاہ شرم گیں یہ تیرا انداز حجاب — نیچی نظریں ہیں تری یا عقدۂ راز حجاب
لب میں ہے حاں پروری آنکھوں میں اعجاز حجاب — دوش پر آنچل ہے یا ہے پردۂ سازِ حجاب
پاک دامانی کی تو سمٹی ہوئی تصویر ہے
جلوۂ حسن تماشا سوز کی تنویر ہے

کہہ رہی ہے چپکے چپکے تیری چشمِ شرم گیں — پیکرِ عفت ہے تو اے نقشِ نازِ دل نشیں
یا زمیں پر جلوہ گر ہے خلد کی اک حورِ عیں — یا کوئی دوشیزۂ رعنا ہے تو اے نازنیں
کتنے دل کش اور سادہ ہیں ترے جذباتِ حسن
تیری خو بو سے ہے قائم آبروئے ذاتِ حسن

آئینے سے آشنا ذوقِ خود آرائی نہیں — دوش بر دوشِ تحیّر نازِ یکتائی نہیں
خود تماشا ہے مگر اپنی تماشائی نہیں — محوِ تمکین و تکبّر شانِ برنائی نہیں
اک عجب دل کش مرقع تو ید قدرت کا ہے
نقش سادہ اک طلسمِ جلوۂ حیرت کا ہے

بھولی بھالی اُف یہ صورت پیاری پیاری یہ ادا — اور یہ شرمیلی چتون اُس پہ آنکھوں کی حیا
یہ خمِ گردن کا عالم اور یہ زلفِ دوتا — یہ لبِ شیریں یہ اندازِ سکوتِ جاں فزا
نقشِ عفت ہے مگر تو پردۂ تصویر میں
جلوۂ نورِ ازل ہے حسنِ عالمگیر میں

عشوہ جو تیری نگہ اے لعبتِ خوش خو نہیں سر بہ بولے چہرہ کے جو آنکھوں میں وہ جلوہ نہیں
جس سے اک عالم پریشاں ہو یہ وہ گیسو نہیں بن کے خنجر دل پہ چل جائیں یہ وہ ابرو نہیں

یہ نہیں وہ تیرِ مژگاں جن سے بسمل ہو جگر
شہ رگِ جاں میں جو بن جائے اثر کر نیشتر

نیچی نظریں ہیں تیری بیگانۂ نازو نیاز اور عیاں آنکھوں سے ہے معصومیت کا تیری راز
کتنی دلکش ہے تری اک اک ادائے جاں نواز ہے چھڑی پھولوں کی یا زیرِ ذقن انگشتِ ناز

کھل کے ہنسنا بھی ابھی گویا نہیں تو جانتی
غنچۂ سربستہ ہے اے شاہدِ رعنا ابھی

اخوذ از "جامِ سرور"

از منشی مہاراج بہادر برقؔ دہلوی

نسیم صبح

سن پیدائش ۱۸۸۴ء سن وفات ۱۹۳۶ء

اے نسیمِ صبح اے روحِ روانِ بوستاں مایۂ راحت، سرورِ قلب اے بادِ وزاں
مات ہے تجھ سے شمیمِ گیسوئے عنبر فشاں تیری ہر جنبش میں دنیائے لطافت ہے نہاں

غم غلط کن تو برائے خاطرِ افسردہ ہے
ترا جھونکا تازگی بخشِ دلِ پژمردہ ہے

تیری پیاری شوخیاں بھی کیسی دل آویز ہیں گدگدانے سے ترے، غنچے تبسم ریز ہیں
موجہائے مشکبو تیری سرور انگیز ہیں وہ شگوفے بھی ہیں خنداں جو ابھی نوخیز ہیں

تو نے چھیڑا نیم وا کلیوں کی باچھیں کھل گئیں
تیرے دم سے اُن کو منہ مانگی مرادیں مل گئیں

تو چمن میں آئی عشقِ گل کا دم بھرتی ہوئی چھاؤں میں تاروں کی گن گن کر قدم دھرتی ہوئی
پہلے آہستہ چلی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی پھر وہی برتیں ادائیں روز کی برتی ہوئی

گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کا صد چاک داماں کر دیا

لطفِ سیرِ بوستاں تجھ سے دو بالا ہو گیا　　تیری شوخی سے نیا رنگِ تماشا ہو گیا
شاخِ گل کو تازیانہ تیرا جھونکا ہو گیا　　اس طرح لچکی کہ اک انداز پیدا ہو گیا

قطرۂ شبنم رخِ گل سے ڈھلک کر گر پڑے
جیسے ساغر سے مئے احمر چھلک کر گر پڑے

تیرے دستِ شوق سے ٹوٹا حجابِ روئے گل　　پرزے پرزے ہو گئی رنگیں نقابِ روئے گل
صبح دم چمکا چمن میں آفتابِ روئے گل　　ہو گیا اظہارِ حسنِ لاجوابِ روئے گل

شانِ خوبی جب رخِ گل سے ہویدا ہو گئی
اور بیتابی دلِ بلبل میں پیدا ہو گئی

آتے ہی صحنِ چمن گلزار تو نے کر دیا　　گرم حسن و عشق کا بازار تو نے کر دیا
سبزۂ خوابیدہ کو بیدار تو نے کر دیا　　نرگسِ بدمست کو ہشیار تو نے کر دیا

تیرے کیف آمیز جھونکے کان میں کیا کہہ گئے
ہونٹوں ہی ہونٹوں میں غنچے مسکرا کر رہ گئے

آہ اے نکہت فروشِ خندۂ گل اے نسیم　　بھینی بھینی ہے تری موجوں میں پھولوں کی شمیم
گلشنِ ہستی میں جاری ہے ترا فیضِ عمیم　　تو ہوائے جانفزا ہے رحمتِ ربِ کریم

فرحت بخشِ قلب پھولوں کی کبھی خوشبو نہ ہو
باغِ امکاں میں نسیمِ دل کشا گر تو نہ ہو

تیرے جھونکے شہرت افزا ہیں برائے بوئے گل　　باندھتی ہے تو گلستاں میں ہوائے بوئے گل
کس لیے جامہ میں پھر پھولی سمائے بوئے گل　　ایک عالم کو جو تو کردے فدائے بوئے گل

تیرے دل آویز جھونکے کیوں نہ ہوں عنبر شمیم
گود پھولوں سے بھری رہتی ہے تیری اے نسیم

دم قدم سے ہے ترے صحنِ گلستاں میں بہار　　تو ہے صدر زینتِ گلشن ہوائے خوشگوار
یہ تبسم زیرِ لب غنچوں کا یہ گل کا نکھار　　ہر ادا کا ہے تری مشاطگی پر انحصار

ہر گلِ تر ہے چمن میں ناز پروردہ ترا
نیم وا کلیاں بھی دم بھرتی ہیں در پردہ ترا

بلبلِ نالاں جو ہوتی ہے قفس میں ناامید　　تو ہی دیتی ہے اسے فصلِ بہاری کی نوید

غنچہ وگل کا سُناتی ہے پیام بار دید　　از سرِ نو دل میں کھڑکاتی ہے اک شوقِ جدید
بخشا ہے قدرت نے اعجاز مسیحائی تجھے
دی ہے پتر مُردہ دلوں کی چارہ فرمائی تجھے
چھاؤں میں تاروں کی وہ آنا ترا انداز سے　　وہ جگانا نیند کے ماتوں کو خوابِ ناز سے
جیسے سرگوشی کرے کوئی کسی دمساز سے　　یا کہے دے کر ٹہوکے یُوں دبی آواز سے
لے جُھکے انگڑائیاں بس گیسوؤں والو اُٹھو
نُور کا تڑکا ہُوا، اے شب کے متوالو اُٹھو

ماخوذ از "مطلع انوار"

از منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی
سن پیدائش ۱۸۶۴ء سن وفات ۱۹۱۲ء

اِتّفاق

سرچشمۂ معادِ زمانہ ہے اتّفاق　　زُلفِ ترقّیات کا شانہ ہے اِتّفاق
بہبودیٔ جہاں کا ترانہ ہے اِتّفاق　　جو پھانس لے ہُما کو وہ دانہ ہے اِتّفاق
جس نے اِس اتفاق کے سودے سے چاہ کی
سانچے میں اُس نے ڈھال لیں شکلیں رفاہ کی
اوصاف سب وجوب کی قسمِ اِتّفاق ہے　　جانِ مفاد کے لیے جسمِ اِتّفاق ہے
جس سے ملے مراد وہ اِسمِ اتّفاق ہے　　افسوں ہے اِتّفاق طِلسمِ اِتّفاق ہے
ہے اِتّفاق شرق سے خورشید اوج کو
معراج فتح اس سے ہے شمشیرِ فوج کو
اس باغ بے خزاں میں کوئی خار ہی نہیں　　نخل ایسا کوئی دوسرا پُر بار ہی نہیں
ابر اس سے بڑھ کے کوئی گہر بار ہی نہیں　　لاکھوں فوائد اس کے ہیں دو چار ہی نہیں
تارے فلک کے اس کے فوائد نہ گن سکیں
سورج سے بھی شمار نہ ہوں، انگلیاں تھکیں

اینٹوں کے اتّفاق نے مسکن بنائے ہیں
غلّے کے اتّفاق نے خرمن بنائے ہیں
پُرزوں کے اتّفاق نے انجن بنائے ہیں
تنکوں کی یک دلی نے نشیمن بنائے ہیں
ریزوں کے اتّفاق سے انبار ہو گیا
قطروں کے سیل سے یم زخار ہو گیا

قائم ہے اتّفاقِ عناصر سے ہر بدن
حرفوں کے اتحاد سے ہے ہستیٔ سخن
تاروں کا اتّفاق ہے بانیٔ پیرہن
نخلوں کے اتّفاق سے ہے خوبیٔ چمن
پیروں میں تابِ آمد و رفت اتّفاق سے
ہے انگلیوں میں حسنِ گرفت اتّفاق سے

ہر کمپنی دکھاتی ہے اس یک دلی کا کھیل
پہیوں کے اتّفاق سے دوڑی جہاں میں ریل
روشن مکان کرتا ہے بتّی سے مل کے تیل
لذت رساں زباں کو ہے شیر و شکر کا میل
قائم جو یک دلی کا بہم عہد ہو گیا
بیدِ مما کھیوں کے لیے شہد ہو گیا

بے اتّفاق پھولنا پھلنا مُحال ہے
بے دستگیر گر کے سنبھلنا مُحال ہے
صرف ایک لب سے بات نکلنا محال ہے
ہوں متّفق نہ پاؤں تو چلنا مُحال ہے
دو دل نہ ایک ہوں تو کوئی کام ہی نہ ہو
دو وقت اگر بہم نہ ملیں شام ہی نہ ہو

دو دل ہوئے جو ایک تو تقدیر لڑ گئی
بگڑی تمام قوم اگر پھوٹ پڑ گئی
الفت کی دل کے پھٹتے ہی کھیتی اُجڑ گئی
ٹوٹا جو پُرزہ چلتی ہوں کل بگڑ گئی
ہر ایک کام ہوتا ہے آپس کے ساتھ سے
تالی بھلا بجی ہے کبھی ایک ہاتھ سے

تکلیف ہیں بشر کو جو اس کی کمک ملے
آلام کو شکست ہو عشرت کو زک ملے
جس شے سے ناامید ہو دل یک بیک ملے
جس کا کبھی گماں نہ ہو وہ چیز تک ملے
ہر دل میں اتّفاق کا جو ہر جو بس گیا
امریکہ و فرنگ میں کنچن برس گیا

جوشِ اتّفاق کا ہو جو ہر ایک رنگ میں
معشوق بہتر ہی رہے آغوشِ تنگ میں

ہر کمپنی کے واسطے مُلکِ فرنگ میں — یہ اتفاق جونک لگاتا ہے سنگ میں
چندے مشن کے اک ہیں ثبوت اتفاق کا
ہے ذکر کارخانوں سے غائب نفاق کا
اِس ملک میں جو نال گڑا ہے نفاق کا — ذکرِ اتفاقیہ بھی نہیں اتفاق کا
ساماں ہے باپ بیٹوں میں ہجر و فراق کا — سیلاب ہے طلاق کا طوفان عاق کا
کی پائمال جھوٹ نے کھیتی رفاہ کی
بحرِ فنا میں کشتیٔ ثروت تباہ کی
توصیفِ اتفاق اگر دل نشیں رہے — ہندوستاں میں کوئی نہ اندوہگیں رہے
برسے ہر اک مکان میں ہُن مجھ میں رہے — دیوار اُٹھائیں سونے کی سب بے یقیں رہے
قسمت اُفق نہ پھیلے گی آپس کی پھوٹ سے
جنسِ نفاق بڑھ کے ہے نادر کی لوٹ سے

ماخوذ از "لمعاتِ اُفق"

گائے

از پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی
سن پیدائش ۱۸۸۲ء سن وفات ۱۹۲۶ء

تو وہ مخلوق ہے خلقت میں نہیں جس کی گناہ — لی ہے قالب میں ترے رُوحِ محبت نے پناہ
تیری صُورت سے عیاں ہوتی ہے انساں کی چاہ — رس بھری آنکھ، سموئی ہوئی امرت میں نگاہ
نقش ہے دل پہ مرے موہنی صورت تیری
خوب دُنیا کے شوالے میں ہے مُورت تیری
تن سے تیرے ہے عیاں نرمیٔ دل کا جوہر — جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھل کر
رنگ کالا ہو کہ اُجلا ہو یہ کہتی ہے نظر — بندرابن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر
کنگرے سے یہ نہیں چہرۂ نورانی پر
حلقۂ قدرت نے سجا ہے تری پیشانی پر

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار — بے پیے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار — وہ اُترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار
ایک اک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

صاحبِ دِل تجھے تصویرِ وفا کہتے ہیں — چشمۂ فیضِ خدا، مردِ خدا کہتے ہیں
درد مندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں — ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں
کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے
آج اِس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

نام جس کا ہے محبت وہ ہے ایماں تیرا — کوئی ہو سب کے لیے فیض ہے یکساں تیرا
زندگی کے لیے محتاج ہے انساں تیرا — کون بیمار نہیں بندۂ احساں تیرا
حلق میں دودھ سے تیرے جو تری رہتی ہے
خشک ٹہنی تنِ لاغر کی ہری رہتی ہے

صُورتیں یاد ہیں اُن بچوں کی پیاری پیاری — زندگی کی جنھیں ایک ایک گھڑی تھی بھاری
تیرے دم سے نہ رہی پیاس کی حالت طاری — ہو گئیں اُن کے لیے دودھ کی نہریں جاری
کتنے گرتے ہُوئے پودوں کو سنبھالا تُو نے
ماں جنھیں چھوڑ چلی تھی انھیں پالا تُو نے

تیرے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار — اپنی گردن پہ لیا پرورشِ قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار — ہے یہ سب اُن کے لہو اور پسینے کی بہار
اُن کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اُگلتی نہ خزانہ اپنا

اہلِ دیں نے تجھے جنت کا سہارا سمجھا — اپنے ایمان کی قسمت کا ستارا سمجھا
سُور بیروں نے تجھے جان سے پیارا سمجھا — تجھ کو اکبرؔ نے سدا آنکھ کا تارا سمجھا
آبرو قوم کی ہے تیری نگہبانی پر
یہی دو حرف لکھے ہیں تیری پیشانی پر

مثل بچوں کے ترے دودھ کے ہیں متوالے — جو ضعیفی سے پڑے رہتے ہیں بستر ڈالے

مست رہتے ہیں ترے فیض سے کرنل والے　　پیارے کہتے ہیں "ماتا" تجھے بچے بالے
تیری الفت سے انھیں منہ نہیں موڑا جاتا
تیری مورت کا کھلونا نہیں توڑا جاتا
میرے دل میں ہے محبت کا بڑی سرمایا　　ماں کے دامن سے سے بڑھ کر مجھے ترا سایا
یاد ہے فیض طبیعت نے جو تجھ سے پایا　　حسن قسمت جو ترا نام زباں پر آیا
اس حلاوت سے جو دعوائے سخن گوئی ہے
دودھ سے تیرے لڑکپن میں زباں دھوئی ہے
ماخوذ از "صبحِ وطن"

گنگا

از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی
سن پیدائش ۱۸۹۰ء سن وفات ۱۹۷۰ء

اک یم پاک ہے تو، نام ہے گنگا تیرا　　آبِ حیواں ہے مجھے آبِ مصفا تیرا
صفحۂ ارض سے ہے نقش ہویدا تیرا　　نقش یہاں ہے سرِ عالمِ بالا تیرا
تیری ہستی میں یہاں جو ہر لافانی ہے　　خاک ہمسر ہو جہاں میں کوئی دریا تیرا
تر زباں وید مقدس تری توصیف میں ہیں　　خوب کھینچا ہے پرانوں نے سراپا تیرا
تو رہا تی ہی رہی حوصلہ بھاگیرتھ[1] کا　　تیرے دیدار سے شاداں ہوا جو پیاسا
سرفرازی تجھے کیلاش پتی نے بخشی　　پاؤں میں وشنو کے ہے مسکن زیبا تیرا
نظر آئی ہمیں گڑھ میں کبھی مکتیشور کے　　دیکھا کاشی میں کبھی روئے دلِ آرا تیرا
لطف سنگم کا بہم خطۂ پریاگ میں ہے　　جادۂ پاک ہے ہم پہلوئے جمنا تیرا
لے لیا گود میں بنگال کی کھاڑی نے تجھے　　عہدِ طفلی میں تھا کیلاش ہنڈولا تیرا

---

[1] راجہ بھاگیرتھ ہندو پرانوں کی روایات کے مطابق دنیا میں گنگا جی کے ظہور کا باعث بھاگیرتھ کی ریاضتِ شاقہ تھی۔

آریہ ورت کے خطّہ کو بنایا بے مثل
تا ابد یوں ہی تعلق رہے اُس کا تیرا
تجھ سے تاریخ سلف ہند کی وابستہ ہے
داستاں اُس کی وہی ہے جو ہے قصّہ تیرا
رام تیرتھ کی سمادھی سے نہ پھر آنکھ کھُلی
ڈوب جاتا ہے ترے عشق میں شیدا تیرا
جوشِ مستی میں تیرا جھوم کے لہریں لینا
آہ وہ ناز سے انداز بدلنا تیرا
دور تر دامنی ہو جاتی ہے تیرے جل سے
پار دُنیا سے لگا تا ہے کنارا تیرا
نہ کبھی دولتِ دیدار سے محروم رہوں
حُسن دیکھا ہی کرے چشمِ تمنّا تیرا
رہے جب تک مرا ویرانۂ ہستی میں قیام
مثلِ مجنوں مرے سر میں رہے سودا تیرا

تیرے پانی سے مری گردِ جہالت دھوجائے
اور مٹ جائے مرے دل سے یہ میرا تیرا

منقول از "کائناتِ دِل"

از تلوک چند محرومؔ

سرورِ ازل

سن پیدائش ۱۸۸۷ء سنِ وفات ۱۹۶۶ء

شہنشاہ بابر اور گورو نانک دیو کا مکالمہ

بابر

ہماری بزمِ عشرت میں جو لے آیا خُدا' بابا
تو بسم اللہ! جامِ بادۂ احمر چڑھا' بابا
جہاں میں آبِ رز سے کونسا ہے پاک تر پانی
کہ دُھل جاتا ہو جس سے دفترِ ماؤشما بابا
نہ میخانے کو دیکھا چاہیئے چشمِ حقارت سے
کہ ہوتی ہے یہیں سے بیخودی کی ابتدا' بابا
نہ یُوں ہی میکشوں کو خاک پر بیٹھا ہوا دیکھو
پہنچتی ہے نظر اُن کی سر فوق السما' بابا
صدا حق حق کی سُنتے ہیں سدا وہ شیشۂ مے سے
اِسی سے دِل ہیں رِندوں کے حقیقت آشنا' بابا
صُراحی کھولتی ہے رازِ دل جب بانگِ قُلقُل سے
فلک سے ہیں پکار اُٹھتے ملائک "مرحبا" بابا
نہ ہو گلبانگ مستوں کی تو دُنیا بزمِ ماتم ہے
ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے دارالفنا' بابا

غنیمت جان کر صحبت کو اِک دُو جام پیتا جا
میانِ محفلِ رندان دُردِ آشام پیتا جا!

گورونانک دیو

مبارک ہوئے امرتجھے، صاحبقراں تیری — رکھے بس سُرخرُو تجھ کو شرابِ ارغواں تیری
دلِ فرخندہ تیرا واقفِ رمزِ حقیقت ہے — اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری
مگر جب کیفیت دل میں ہے کیفِ مے کی حاجت کیا — غرض محفل سے کیا خلوت ہے جب دشکِ خلُن تیری

مَے انگور پی کر کوئی متوالا ہوا تو کیا!
رہا بے کیف دِل شغلِ مَے و مینا ہوا تو کیا!

وہ مَے اپنی ہے جس سے بن پئے مخمور رہتے ہیں — خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں چوُر رہتے ہیں
وہ میکش ہیں کہ مہر و ماہ اپنے جام و ساغر ہیں — جو صہبائے مروّت سے سدا بھرپور رہتے ہیں
ہمارا دورِ مے ہر ہر نفس کے ساتھ چلتا ہے — اسی سے ہر نفس ہر لحظہ ہم مسرُور رہتے ہیں
کثافت روح میں آلائشِ دنیا سے آتی ہے — شرابِ ظاہری سے اہلِ باطن دور رہتے ہیں
چڑھا دو اُن کو سُولی پر بھی تو حق حق سُناتے ہیں — جو عاشق ہیں وہ سرشارِ مئے منصور رہتے ہیں
لنڈھائے ہوں جنھوں نے خم کے خم صہبائے عرفاں کے — کہاں وہ طالبِ افشردۂ انگور رہتے ہیں

مُناسب ہے یہی، ترکِ مَے انگور کر شاہا!
ہمارے جام سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا!

ماخوذ از "گنجِ معانی"

شاعری

چودھری جگت موہن لال رواںؔ

شاعری کیا ہے اِک احساسِ قوانینِ وجود — دِل کے جذبات کا اظہار بتائیدِ قیود
برہمن ہے دلِ شاعر بُتِ فطرت معبُود — جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسنِ نمود

جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینے پہ تصویر اُتر آتی ہے

ں تصویر کا اِک رُخ ہے یہ دنیائے لطیف — عالمِ کون و مکاں ہے یہی اُس کی تعریف
، زباں اس کے ادا کرنے کو اِک جزوِ ضعیف — منبرِ بارگہہ خاص ہے یہ فنِ شریف

پردہ اسرارِ مجازی کا اٹھانے والا
آئینۂ روئے حقیقت کو دکھانے والا

، ہے شاعر کا کہ اِک منظرِ انوارِ جمال — اور جولانگہہ دل وسعتِ میدانِ خیال
ہ زن ہوتا ہے جب مستِ سخن صاحبِ قال — بزمِ فطرت میں ہر اِک چیز کو آجاتا ہے حال

کوہ جھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے
چشمے رُک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

شمعِ دل و جاں دائرۂ شعر میں ہے — وسعتِ کون و مکاں دائرۂ شعر میں ہے
دۂ برقِ طپاں دائرۂ شعر میں ہے — الغرض سارا جہاں دائرۂ شعر میں ہے

جس بلندی پہ فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
تیرے شاعر اُسے ٹھکراتے ہوئے چلتے ہیں

ری اُردو تیری محفل میں سخن ور کم ہیں — سنگریزے تو بہت ملتے ہیں جوہر کم ہیں
ٹ لگ جائے جن اشعار سے دل پر کم ہیں — جن میں پنہاں ہوں خیالات کے دفتر کم ہیں

میرؔ سمجھا تھا فقط معنیٔ اسرارِ سخن
ختم غالبؔ پہ ہوئی گرمیٔ بازارِ سخن

شاءاللہ زہے وسعتِ دامانِ غزل — بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
نم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل — پوچھئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اِس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اِس میں

ماخوذ از "روحِ رواں"

گورونانک دیو

مبارک ہوئے احمر تجھے، صاحبقراں تیری　　رکھے بس سرخرو تجھ کو شراب ارغواں تیری
دلِ فرخندہ تیرا واقفِ رمزِ حقیقت ہے　　اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری
مگر جب کیفیت دل میں ہے کیفِ مے کی حاجت کیا　　غرض محفل سے کیا خلوت ہو جب رشکِ غزل تیری
مے انگور پی کر کوئی متوالا ہوا تو کیا!
رہا بے کیفِ دل شغلِ مے و مینا ہوا تو کیا!

وہ مے اپنی ہے جس سے بن پئے مخمور رہتے ہیں　　خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں چور رہتے ہیں
وہ میکش ہیں کہ مہر و ماہ اپنے جام و ساغر ہیں　　جو صہبائے مروق سے سدا بھرپور رہتے ہیں
ہمارا دورِ مے ہر ہر نفس کے ساتھ چلتا ہے　　اسی سے ہر نفس ہر لحظہ ہم مسرور رہتے ہیں
کثافت روح میں آلائشِ دنیا سے آتی ہے　　شرابِ ظاہری سے اہلِ باطن دور رہتے ہیں
چڑھا دو اُن کو سولی پر بھی تو حق حق سناتے ہیں　　جو عاشق ہیں وہ سرشارِ مے منصور رہتے ہیں
لنڈھائے ہوں جنھوں نے خم کے خم صہبائے عرفاں کے　　کہاں وہ طالبِ افشردۂ انگور رہتے ہیں
مناسب ہے یہی ترکِ مے انگور کر شاہا!
ہمارے جام سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا!

ماخوذ از "گنجِ معانی"

شاعری

چودھری جگت موہن لال رواں

شاعری کیا ہے اک احساسِ قوانینِ وجود　　دل کے جذبات کا اظہار بتائیدِ قیود
برہمن ہے دلِ شاعر بُتِ فطرت معبود　　جلوہ پیرائے ازل کا ہے یہاں حسنِ نمود
جب نظر راز کے پردوں سے گزر جاتی ہے
دل کے آئینے پہ تصویر اُتر آتی ہے

اُسی تصویر کا اِک رُخ ہے یہ دنیائے لطیف — عالمِ کون و مکاں ہے یہ سب اُس کی تعریف
بے زباں اس کے ادا کرنے کو اِک جزوِ ضعیف — منبرِ بارگہہِ خاص ہے یہ فنِ شریف

پردہ اسرارِ مجازی کا اٹھانے والا
آئینہ روئے حقیقت کو دِکھانے والا

دِل ہے شاعر کا کہ اِک منظرِ انوارِ جمال — اور جولانگہِ دِل وُسعتِ میدانِ خیال
نغمہ زن ہوتا ہے جب مستِ سخن صاحبِ قال — بزمِ فطرت میں ہر اِک چیز کو آجاتا ہے حال

کوہ جُھک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے
چشمے رُک جاتے ہیں اشعار کی موسیقی سے

نورِ شمعِ دِل و جاں دائرۂ شعر میں ہے — وُسعتِ کون و مکاں دائرۂ شعر میں ہے
جلوۂ برقِ طپاں دائرۂ شعر میں ہے — الغرض سارا جہاں دائرۂ شعر میں ہے

جس بلندی پہ فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
سچے شاعر اُسے ٹھکراتے ہوئے چلتے ہیں

پیاری اُردو تری محفل میں سخن ور کم ہیں — سنگریزے تو بہت ملتے ہیں جوہر کم ہیں
چوٹ لگ جائے جن اشعار سے دل پر کم ہیں — جن میں پنہاں ہوں خیالات کے دفتر کم ہیں

میرؔ سمجھا تھا فقط معنیِ اسرارِ سخن
ختم غالبؔ پہ ہوئی گرمیِ بازارِ سخن

اللہ اللہ زہے وُسعتِ دامانِ غزل — بُلبُل و گُل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل
ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل — پوچھئے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

ضبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اِس میں
یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وُسعت اِس میں

ماخوذ از "رُوحِ رواں"

موہن کمار شاد

جھومتی ہیں وہاں بہاریں سی
ناچتے ہیں وہاں ستارے سے
وہ نظر جس میں تم سا شادؔ
گم نہیں ہے کسی نظارے سے

ہم نے اپنے لہو کی بوندوں سے
لوگ کہتے ہیں غم کو پالا ہے
کون سمجھے گا دوستو لیکن
غم نے در اصل ہم کو پالا ہے

ابرِ رحمت نے پردہ داری کی
آج میری گناہ گاری کی
لب تک آیا ہے جو بھی ساغر ہے
ہر طرف چھا گئی ہے تاریکی

زندگی! اپنے آئینے میں تجھے
ایسا چہرہ نظر نہیں آتا
ظلم کرنے کا حق تو ہے ہم کو
ظلم سہنا مگر نہیں آتا

دل پہ گزری جو واردات نہ پوچھ
میری خوش قسمتی کی بات نہ پوچھ
لے ہمسفر ساس گیا محمود
دوستوں کی نوازشات نہ پوچھ

ہم جو ہر وقت رنج سہتے ہیں
ظاہرا گو خموش رہتے ہیں
ہم نشیں! دل کی واردات مگر
ہم نظر کی زباں سے کہتے ہیں

ہماری یاد میں پیرِ مغاں روتے ہیں پیالے	صراحی لے رہی ہے ہچکیاں روتے ہیں پیالے

اے شادؔ رہبروں کے رویے کو دیکھ کر	آنا پڑا ہے راہ زنوں کی پناہ میں

اسی لئے ہمیں کہتے ہو تم چمن دشمن	کہ ہم خزاں میں بھی ذکر بہار کرتے ہیں

حبیبو! جس سے دل کر رہے ہو	مری خوش قسمتی ہے میں نہیں ہوں
یہ تو بیکار دل ہے تم نہیں ہو	یہ میری بے خودی ہے میں نہیں ہوں

جینے کا سہارا

صالحہ عابد حسین

رات سے وہ بہت اداس تھا۔!

بچپن کی یادیں، جب ماں کی آغوش کی گرمی باباکی شفقت کی چھاؤں، بہنوں کی اُلفت اس پر نثار ہوتی رہتی تھی۔ جوانی میں بھائیوں اور ساتھیوں کی دوستی اور محبت اس کے نوجوان ذہن کو محبت کی غذا پہنچاتی تھی! کس قدر پیار کرتے تھے بڑے بھیا اس سے! بالکل بیٹوں کی طرح چاہتے اور بھابی۔ وہ تو ماں کے بعد بالکل ماں کا سا پیار دیتی تھیں۔ سہیلیوں کی طرح اس کے دکھ سکھ کو سنتی تھیں ــــ ہائے بڑی باجی اور منجھلی آپا کی الفت وہ کیسے بھولے؟ اور یہ سب مل کر جب اس کی سالگرہ منایا کرتے ــــ وہ سب سے چھوٹا تھا نا! کیا رونق چہل پہل اور پیار کی برکھا ہوتی تھی۔ بھتیجے بھتیجیاں، بھانجے بھانجیاں سبھی سے دوستی اور بے تکلفی تھی۔ وہ سب کو چاہتا بھی تو بہت تھا! سب کو تحفے لاکر دیتا۔ سیریں کراتا ــــ اور ماں باپ کے غصے سے بچایا کرتا تھا!

اور موی! آہ ــــ وہ اس کی محبوبہ، دوست ساتھی، رفیق کیا نہ تھی! جب دور شہر میں اس کا کام لگا تو وہی تو تھی جس نے مصیبت ــــ بیماری تکلیف خوشی اور دکھ سکھ میں اس کا یوں ساتھ دیا کہ جیسے وہ ایک جان دو قالب بستیاں ہوں۔ اولاد رشک کرتی: اماں اور ابو میں کتنا

پیار ہے ؛ ہم تو تصور بھی نہیں کرسکتے کہ کوئی دو آدمی یوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ وہ بیمار ہوتا تو بیوی پریشان کا چین رات کی نیند حرام ہو جاتی ہر کام سے بچوں تک سے ۔ بو کہ بس اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھ جاتی۔ اور جب بیوی بیمار ہوتی یا بچے بیمار ہوتے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی تھی! کسی کام میں دل نہ لگتا ہر وقت اس کی خدمت، دوا علاج کے لیے بھاگ دوڑ دلداری اور اس کو خوش رکھنے کی کوشش۔ بس یہی زندگی کا مقصد رہ جاتا۔

لوگوں کو رشک تھا ان کی زندگی پر۔ چاہنے والے کہتے کہیں نظر نہ لگ جائے اسے جوڑے کو پیارے پیارے ہونہار بچے، میاں بیوی کی محبت ایسی بے مثال، اور خاصی خوشحال زندگی تھی اور اگر تنگی بھی تو پیار اور مفاہمت سب کو گوارا سا دیتی!

بابا اور ماں تو بہت پہلے ساتھ چھوڑ گئے تھے مگر بھائی صاحب بھابی اور بہنوں کی دلداری اور محبت نے زخم پر مرہم رکھا شادی ہوئی تو بیوی نے دنیا ہی بدل دی تو راحت کا مرکز مکمل ہو گیا

ذہین اور قابل بچے ترقی کرنے لگے۔ اعلیٰ امتحان پاس کیے۔ کسی کو بیرون ملک میں اچھا عہدہ مل گیا! ایک لڑکی کی کامیاب شادی ہو گئی دوسری اس کے پاس رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی رہی اور چھوٹا بیٹا لکھنؤ میں تعلیم پانے لگا۔ اور پھر ــــ پھر زندگی نے ــــ خوشیوں کا تاوان لینا شروع کر دیا ــــ!

بھابی اچانک دل کے دورے میں ختم ہو گئیں۔ اور بڑے بھیا ــــ بڑھاپے میں بے سہارا رہ گئے۔ ان کے بچے تو پہلے ہی اپنا گھر بسا کر دور دیس چلے گئے تھے! ان کی موت کتنی دردناک تھی، انتقال ہوا تو نوکر کے سوا کوئی پاس نہ تھا۔ اسے بھی بعد میں خبر ملی۔

اور پھر بڑی باجی اولاد نہ ہونے کا دکھ لیے تنہا ویران زندگی بسر کر کے خدا کو پیاری ہو گئیں! ان کے میاں نے تو چھوڑ ہی دیا تھا۔ بڑی باجی جو اسے اپنا بیٹا کہتی ہی نہیں بلکہ سمجھتی بھی تھیں، آخر وقت اسی نے اور بیوی نے جتنی خدمت ان کی ہو سکتی تھی کی۔ منجھلی باجی تو سب کو چھوڑ کر پاکستان جا کر بس گئی تھیں۔ ان کے میاں کو جائیدادیں الاٹ ہو گئی تھیں اور بچوں کو گلف کے ملکوں اور امریکہ میں بڑی بڑی نوکریاں مل گئی تھیں۔ سنا ہے جب ان کے میاں کا انتقال ہوا تو ان لوگوں نے ان کا مرنا اس قدر دھوم دھام سے کیا کہ کوئی شادی میں بھی اتنا خرچ نہیں کرتا...

آہ — کوئی مرکر چھوٹا — کوئی زندگی میں بچھڑ گیا! کاش — کاش میری بیوی زندہ رہتی! اس کے دم سے تو زندگی زندگی تھی اب وہ زندہ نہیں زندگی کے کاندھے پر ایک لاش ہی تو ہے جو اس کی محبت کی لاش کو اپنے سینے سے لگائے زندگی کے یہ دن بتا رہا ہے۔

اس کی نظر سامنے لگی بڑی سی تصویر پر پڑی جس میں وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ یہ رنگین تصویر ان کی شادی کی سالگرہ پر بچوں نے بنوائی تھی! کس قدر شوق اور محبت سے بچے ان کی سالگرہ منایا کرتے تھے۔ وہ اس کی سالگرہ پر بہت اہتمام کرتی خاص کر پچاسویں سالگرہ پر تو خاندان بھر کو جمع کیا تھا بڑی سی دعوت تحفے، اپنے اور بھائی بہنوں اور سسرال والوں اور دوستوں کے جوان بچوں کا جشن منانا — اس کے منع کرنے کے باوجود اس قدر اہتمام ہوتا۔ اور وہ سب کہتے امی ہم اپنے بابا سب اے بابا تو کہتے تھے کہ ساٹھویں سالگرہ بہت دھوم اور شان سے کریں گے!

"بڈھے کی" وہ ہنستا تھا!

آپ کبھی بڈھے نہیں ہوں گے۔ اب بھی جوان ہیں — ہم سے زیادہ شاداب، خوب صورت اور زندگی سے بھرپور — تب بھی ایسے ہی رہیں گے۔ اس دن ہم آپ دونوں کو دولہا دولہن کی طرح سجائیں گے...... .. جانے کیا اور کہا،

دولہا — دلہن — ساٹھویں سالگرہ — جشن! — مسرت۔

کہاں ہیں وہ سب جنھوں نے یہ منصوبے بنائے تھے؟

اس کی جان اس کی روح اس کا ساتھ چھوڑ گئی! آہ وہ جان لیوا مرض۔ اس نے پیسہ پانی کی طرح بہادیا — پینشن بیچ دی۔ مگر — مگر وہ اس کا ساتھ چھوڑ گئی! آہ وہ اس کی آخری بے بسی کی نگاہیں "جان"! (وہ دونوں ایک دوسرے کو یہی کہا کرتے تھے)

"جان تم تنہا رہ گئے — تمہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ صبر و برداشت کی وہ کون سی قوت تھی جو اتنے دن سے اُسے سنبھال رہی تھی! اس نے مسکرا کر اُسے سہارا دیا —

"نہیں تم اچھی ہو رہی ہو" اور دل میں کہا ابھی تو وقت آنا ہے سچی رفاقت کا "میری جان ہمیں کوئی جدا نہیں کرسکتا۔ تمہارے بغیر میں مرجاؤں گا"

مگر کون مر سکتا ہے کسی کے ساتھ! وہ آج اتنے برس بعد بھی زندہ ہے۔ زندگی ——— یہ زندگی جس میں بیماریاں ہیں، تنہائیاں ہیں، مزاج اور طبیعت کے خلاف باتیں ہیں، عزیزوں اور دوستوں کی بے اعتنائیاں ہیں، اولاد کی بے پیاری اور بڑھاپا ——— بیماری ——— تنہائی ——— نانی اماں کہا کرتی تھیں: جسے لاڈ گھنیرے اُسے دکھ بہتیرے ——— اور پھر نانی اپنے بچپن کو یاد کرنے لگتیں۔ جب سارا خاندان اس اکلوتی چھبیلی لڑکی پر فدا تھا۔ اور پھر اپنے شوہر، اس کے نانا کے گزر جانے کے بعد ——— ان کا کہنا تھا کہ کس طرح وہ تنہا رہ گئیں۔ بزرگ پہلے ہی خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ شوہر جیسے بھی تھے ان کا سہارا تھے، کم سے کم وہ انھیں چاہتے تھے۔ مگر ان کے بعد بہو اور بیٹے نے تو چھوڑ ہی دیا۔ بیٹی اور داماد نے بھی۔ ہاں ہاں میرے بچے یہی یہ ہے ماں باپ کون تیری پروا کرتا ہے بچے ——— دیکھ دالان کے اس کونے میں پڑی ہوں۔ دو وقت کھانا ناشتہ دے کر سمجھتے ہیں سب فرضوں سے ادا ہو گئے۔ ارے کوئی گھنٹے دو گھنٹے پاس آکر نہیں بیٹھتا۔ میرے دل کی حالت کوئی نہیں سمجھتا ——— میرا دکھ نہیں بٹاتا ——— جیسے میں پتھر ہوں۔ جس کے دل پر صدموں پر صدمے پڑ رہے ہیں۔ جس کی دنیا لٹ گئی ——— بیٹے نے چھوڑ دیا ——— ارے کوئی تو پوچھے کہ مجھ پر کیسا گزر رہی ہے ——— یوں بھرا خاندان ہے مگر آتے بھی ہیں تو سلام کر کے یوں گزر جاتے ہیں جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ طبیعت بھی پوچھیں گے تو جواب نہ سنیں گے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا کہتے ہیں۔ بس وہ تو اپنی بیماریوں کا راگ الاپنے لگتی ہیں۔ ... پوچھو کس کے پاس اتنی فرصت ہے.....

نانی اماں یونہی کُڑھتی رہتیں اور وہ ان سے سٹ کر بیٹھ جاتا: نانی اماں ——— دنیا میں یہی ہوتا ہے۔ دیکھیے نا سب اپنے اپنے کاموں میں کس قدر مصروف ہیں ——— بوڑھے لوگوں کو دینے کے لیے آج کل کے زمانے میں کس کے پاس وقت ہے؟ آپ تو کتابیں پڑھا کیجیے۔ عبادت تو کرتی ہی رہتی ہیں ——— اور ہاں میں آپ کے لیے ایک ریڈیو خرید کر لاؤں گا جب نوکر ہو جاؤں گا۔ اسی کو سنا کیجیے گا۔ اور بچوں کو قرآن پڑھایا کیجیے ——— جانے وہ کیا کیا ان کو سمجھاتا رہتا۔ وہ اس کی بلائیں لیتیں لگاتیں: ارے تو جیتا رہے سو برس۔ نانی کی جان۔ تو ہی تو ہے۔ کتنا میرا خیال کرتا ہے جب کالج کی پڑھائی سے چھٹیوں میں آ ملتا ہے۔ تو بھی تو نئے زمانے کا ہے۔ اللہ ایسی اولاد سب کو دے۔

وہ مسکراتا ۔۔۔ نانی اسے ایک نسل اور دو نسل کا فرق کیا جاتا ہے ۔۔۔ بات یہ ہے
کہ ان میں ۔۔ ان میں ۔۔ وہ آگے کچھ نہ کہتا کہ نانی اماں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ وہ کہنا
چاہتا تھا ان کے خیالات اور دلچسپیوں اور ہر چیز میں بہت فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ۔۔
اور پھر بڈھوں سے وہ لگاؤ کہاں ہوتا ہے....

آج نانی اماں کی اتنی یاد کیوں آرہی ہے ہاں کیوں نہ آئے۔ آج وہ نانی اماں کی جگہ ہے جنکا
ہے۔ وہ تنہا ہے ۔۔۔ اداس ہے ۔۔ اس میں دوسری نسل میں جنریشن گیپ ۔۔
GENERATION GAP پیدا ہو چکا ہے۔ تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے۔ وہ ان کا زمانہ تھا
اس وقت گھر میں کتنے لوگ ہوتے تھے تنہا ہوتے ہوئے بھی تنہائی نہیں ہوتی تھی ۔۔۔ اور
آج ۔۔۔ آج کی زندگی ۔۔۔ مصروفیت کی زندگی خود غرضی کی زندگی ۔۔۔ بھاگ دوڑ کی زندگی
خود پرستی اور حرص والی روانی کی زندگی۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہے۔ ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کو کون
پوچھے۔ کون وقت دے۔ اس کے جذبات اور احساسات کا خیال کرے ... بس جانے
والے ۔۔۔ جان نچھاور کرنے والے تو اس دنیا کو چلے گئے جہاں سے کسی کی خبر تک نہیں آتی۔
بچے ۔۔۔ جو اپنی اپنی زندگی میں مگن ہیں ۔۔ بہن بھائیوں کی اولاد، دوستوں کے خاندان
والے کیوں پوچھیں گے ۔۔ اور جو ایک دو دوست رہ گئے ہیں ۔۔۔ وہ بھی اس کی طرح
تنہا ہیں۔ بیمار ہیں ۔ زندگی سے بیزار ہیں ۔ مگر وہ تو زندگی سے بیزار نہیں وہ تو اب تک لڑ
رہا ہے اس سے ۔۔۔ زندگی کی شمع کی لو جلائے رکھنے کے لیے کیا کیا جدوجہد نہیں کر رہا ہے۔
گٹھیا چلنے نہیں دیتی مگر وہ چلتا ہے۔ نگاہ کمزور ہو گئی مگر وہ لکھتا اور پڑھتا ہے۔ دل ساتھ نہیں دے رہا
مگر وہ اسے سنبھالے ہے مگر جذبات اور احساسات ۔۔۔ آہ! یہ اسے کچلے دے رہے ہیں!

اس تنہا ویران زندگی سے تو ۔۔۔ وہ کہتا ہے کہ وہ بچھڑے قافلے سے جا ملے۔
یہ چند عزیز اور پڑوسی اور اس کی سب سے چھوٹی بیٹی ۔۔۔ اگر ان کی محبت اور رفاقت حاصل
نہ ہوتی تو ۔۔۔ تو ۔۔ وہ کیا کرتا! بیوی کے داغ کو یادوں کی نبضوں سے چمکائے وہ اب بھی کام کرتا
رہتا ہے ۔۔ عبادت کرتا رہتا ہے ۔۔۔ لوگوں سے تعلقات بنانے کی کوشش کرتا ہے! اس میں
اسے کچھ سکون ملتا ہے۔ نہیں تو بیٹے کی بے نیازی، بڑی لڑکی کی دوری اور بے پروائی اور۔۔ اور۔۔

صبح کی اذان کی آواز آئی۔ رات بیت گئی۔ جاگتے ہی ساتھ ہی وہ پلنگ سے اٹھ بیٹھا۔ صبح
پو پھٹ رہی ہے اور اس کی ساٹھویں سالگرہ۔ ساٹھ سال اُف!
کہاں ہیں وہ سب چاہنے والے۔ آؤ دیکھو آج میں اکیلا ہوں۔ بس تمہاری یادیں میرے
میں جشن منا رہی ہیں!
اس نے تپکتے دل کو سنبھالا اور خالق حقیقی کی بارگاہ میں سر جھکا دیا!
کوئی نہ ہو۔ وہ تو ہے!
آٹھ بجے وہ ناشتہ کی میز پر بیٹھ گیا۔ ملازم نے ناشتہ لگا دیا تھا۔
آج اس وقت بے اختیار "موتیا" یاد آنے لگی۔ اگر وہ ہوتی تو یہ دن اتنا سونا نہ لگتا!
مگر اس نے اصرار کرکے اسے باہر بھیج دیا تھا اتنا اچھا چانس ملا تھا اور وہ باپ کی خاطر جانے سے
انکار کر رہی تھی! اس نے کہا تھا نہیں میں یہ سال جھیل لوں گا تم اپنا مستقبل نہ خراب کرو۔ جاتے
وقت کہا تھا تو میں جلدی آؤں گی اور ہر ہفتے نہیں ہر روز خط لکھوں گی!
ساتھ کے گھر سے اس کا بھانجہ "خدا حافظ ماموں جان" کہتا تیزی سے بریف کیس لیے
گزر گیا۔ ذرا دیر میں دونوں لڑکیاں ماموں جان ہم جا رہے ہیں کہہ کر اسکول اور دفتر چلی گئیں،
دوسرے افراد اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے!
اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی! انہیں کسی کو یہ یاد نہیں کہ آج اس کی ساٹھویں سالگرہ ہے!
اور وہ سب پیارے اس دنیا سے جا چکے ہیں یا اس کی دنیا سے دور ہیں جو اس جشن کو منانے کے
خواب دیکھا کرتے تھے۔ بیٹا تو دو قدم پر ہے۔ وہی آسکتا تھا فون کر سکتا تھا تار ہی دے دیتا۔
احساس تو نہ ہوتا کہ وہ سب کے ہوتے ہوئے تنہا ہے۔ وہ کوئی بچہ نہیں کہ آج سالگرہ منانے
کا شوق ہو۔ مگر اپنے بچوں کی محبت اور قرب کی ——— اسی بہانے اس کی خواہش تھی۔ کتنے دن
سے وہ اس شہر میں رہتے ہوئے بھائی بہن کی اولاد سے نہیں مل سکا ہے اس نے سوچا تھا شاید وہ
لوگ آجائیں! ——— اس نے برائے نام ناشتہ کیا ——— اور پھر سے اٹھ رہا تھا کہ سامنے سے پوسٹ
مین آتا نظر آیا بے اختیار وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ایک خط ہاتھ میں پکڑا دیا! فارن لیٹر۔
اس کی بیٹی کی تحریر۔ دل دھڑک اٹھا بے قراری سے اس نے خط کھولا۔

پیارے ابو :

ساٹھ سال تک اس دنیا میں رہ کر آپ نے مختلف حیثیتوں سے اپنا رول
اس کے اسٹیج پر بہترین اداکاری کے ساتھ ادا کیا۔ اپنی ذات سے لوگوں کو سکون
عافیت اور محبت کا احساس دلایا اپنی محرومیوں کو اس طرح اپنے اندر چھپا کر رکھا کہ کبھی
کسی کو ان کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔ آپ نے وقت کے ساتھ بہت خوب صورتی
اور وقار کے ساتھ COMPROMISE کیا۔ زندگی کا مقابلہ حوصلے سے
کیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ زندگی سے لڑنے کا حوصلہ آپ میں آج بھی ہے۔ کتنی خوشی کی
بات ہے کہ آپ آج اپنی زندگی کے ساٹھویں دہے میں قدم رکھ رہے ہیں تو اس طرح
کہ آپ کا حوصلہ بلند ہے آج بھی آپ دوسروں کے لیے ناگزیر ہیں۔ آپ کو لوگوں کی
طرف نہیں دیکھنا ہوتا وہ آپ کی طرف محبت اور مدد کے لیے دوڑتے ہیں۔ آپ وہ
مرکز ہیں جس کے گرد سب گھوم رہے ہیں۔ آپ میری زندگی ہیں میرا حوصلہ میری
مسرت میری عافیت اور کیا کیا نہیں ہیں؟

تندرستی حوصلے اور ہمت کی دعاؤں کے ساتھ آپ کی بیٹی

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو خط پر گر رہے تھے اور تڑپتے دل کو جیسے کسی نے تھام
لیا تھا!

فون کی گھنٹی بجی ــ اور بجتی چلی گئی۔ اس کے دونوں دوست کئی پرانے کولیگ فون پر مبارکباد
دے رہے تھے! اتنے میں سامنے سے اس کی چچازاد بہن اور اس کے بچے ٹیکسی سے اترتے
نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں کیک کا بڑا سا ڈبہ تھا!

اس نے آگے بڑھ کر سب کو بازوؤں میں تھام لیا برف کی سل پگھل گئی تھی! زندگی میں اوشا
کی کرن چمک اٹھی تھی!

یہ سہارے نہ ہوں تو انسان کیسے زندہ رہے!
ہاں دو نسلوں میں بھی محبت اور دوستی کی شمع روشن رہ سکتی ہے!

اللہ دے بندے

رضیہ سجاد ظہیر

جب فخرو سری سے سنبھل آیا تو اس نے دھوتی کی جگہ تہمد باندھا، مرزئی اتار کے کرتا پہنا، سنبھل سے مرادآباد پہنچا تو تہمد کی جگہ پاجامے نے اور کرتے کی جگہ قمیض نے لے لی۔ سری میں وہ الف کے نام لٹھا نہیں جانتا تھا، سنبھل میں ہمارے ماموں نے اس کو اُردو لکھنا پڑھنا اور اے، بی، سی، ڈی سکھائی اور مرادآباد پہنچ کر تو وہ اتنا تیز ہو گیا کہ ہمارے بیرسٹر ماموں جو انگریزی کی کتاب کہتے وہ الماری میں سے نکال لاتا۔ قانون کی ایک ایک کتاب پہچاننے لگا۔ سب قصے، داستانیں، رسالے ناول اسے معلوم ہو گیے۔

لیکن اس تمام ترقی کے باوجود ایک کمی اس کی شخصیت میں رہ گئی کہ وہ بوٹ جوتا نہیں خرید سکا، بوٹ اس وقت بھی کافی مہنگے تھے، اور پانچ روپیہ مہینے میں سے تین روپیہ گھر بھیجے اور ایک روپیہ فاخری دادی کے پاس جمع کرانے کے بعد بچتا ہی کیا تھا جو فخرو بوٹ جوتا بھی خریدتا۔ دو آنہ مہینہ مسجد کی چراغی، دو آنہ یتیم خانہ کا چندہ، پھر مہینے میں دو بار حجامت، بیڑی، ماچس، سر کا تیل، کپڑے دھونے کا صابن —— یہ سب کوئی مفت تو آتا نہیں تھا —— اس لیے اس کی شخصیت میں یہ کمی رہ گئی —— اور دوسری کمی اس کی ذہنیت میں رہ گئی ——

—— کہ وہ نماز پڑھنے سے برابر انکار کرتا چلا گیا —— ترقی کے کسی بھی اسٹیج پر اس نے نماز نہیں
پڑھی، اس معاملہ میں ہمارے بیرسٹر ماموں کو اس کا یہ بے رخی کے ازیل بیلوں والا رویہ سخت ناپسند تھا۔
بیرسٹر ماموں کئی سال ولایت رہے تھے، سوٹ پہنتے تھے، انگریزی فَروٹ بولتے تھے
مگر نماز پانچوں وقت کی پڑھتے تھے۔ جب وہ نماز کے لیے باآواز بلند اذان دیتے تو باقی گھر والوں
کی سٹی گم ہو جاتی تھی اور ہر شخص اُن کی گرجدار آواز کے رعب میں آکر فوراً نماز پر کھڑا ہو جاتا تھا۔
ہمارے نانا جب تک جئے اس بات پر فخر کرتے رہے کہ اُن کے کئی دوستوں کے بیٹے
تو ولایت جاکر اپنا دین ایمان بھول گئے۔ مگر ان کا بیٹا اتنے دن انگلستان رہنے کے باوجود
بھی پانچوں وقت کی نماز پڑھتا اور تیسوں روزے رکھتا تھا، ابھی اس کی نماز کی نوزنڈیاں تک
بھی قائل تھیں، ایسی جنے کتنی ہی عورتوں کو اس نے نماز سکھا کے اس نے ان گمراہوں کی عاقبت
سنواری تھی۔ اس لیے تو ماموں کہتے تھے کہ فخرو کے ہاتھ کا تو پانی بھی نہ پینا چاہیے، یہ کبھی ایک
ٹکر نہیں مارتا۔ اس کے دل پر تو اس نے مہر لگا دی بھر، وہ بے چارے کیا کرے، اب اگر کوئی
خود ہی جہنم کا کندہ بننا چاہے تو کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔

فخرو روزے تیسوں رکھتا تھا، رمضان بھر جو کچھ ہو سکتا خیرات کرتا مسجد میں آنے والوں
کے لیے باہر کی لالٹین میں دو پیسے روز کا تیل اپنے پاس سے ڈلواتا تاکہ راستے پر روشنی رہے
اور لوگوں کو آنے جانے میں آسانی ہو —— پر خود مسجد کے اندر نماز پڑھنے کبھی نہ جاتا ——
اور کاموں سے پچاس پھیرے مسجد کے کرتا۔

ماموں رمضان کے دوران کئی بار اس سے کہتے "ابے فخرو تیرے روزوں سے فائدہ ہی
کیا ہے، تو بیکار فاقے کرے ہے، بغیر نماز کے کہیں روزے ہوئے ہیں!"

"اجی بالسٹر صاحب آپ نے جو وہ کتاب پڑھائی تھی، اجی وہی مولی زمان علی صاحب کی
لکھی دی دینیات کی پہلی کتاب تو وس میں تو نماز الگ ورق پر لکھی ہے، اور روزہ الگ ورق پر
لکھا ہے، اور یوں تو اس میں کہیں نہ لکھا کہ روزہ بغیر نماز نہ ہو سکتا یا نماز بغیر روزہ نہ ہو سکتا۔"
اب اس صریحی منطق کا ماموں کے پاس کیا جواب تھا۔ وہ اسے دھتکارتے ہوئے کہتے
چل کمبخت دُور ہو، لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا!

دلچسپ بات یہ تھی کہ فرو نے کبھی بیرسٹر ماموں سے انکار بھی نہیں کیا تھا کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا پر کچھ ایسا ہو جاتا تھا کہ وہ صاف بچ نکلتا اور پھر بھی مزے میں رہتا۔
مثلاً مغرب کی نماز کے لیے ماموں مسجد جانے لگتے تو فرو سے بھی کہتے
"ابے چل مسجد" مغرب کی اور صبح کی نماز وہ مسجد میں پڑھتے تھے۔ پہلے گھر میں اذان دیتے پھر مسجد میں جا کے نماز پڑھتے۔ فرو گھر کے اس کمرے کی طرف اشارہ کرتا جہاں موکل مٹھا کے نے تھے اور بڑی معصوم صورت بنا کے سرگوشی کرتا۔
"ابھی بڑا موٹا موکل میٹھا بے گا بالشر صاحب۔ جو میں تمہارے ساتھ چلا جاوں گا تو وہ بھلی کی تینوں کھسل جاوے گا۔ تم پڑھ یاؤ نماز جتے میں اسے دراجیٹ نئی باتوں میں الجھاؤں ہوں اور تم بھی ذرا جلدی ہی لوٹیو"
اب اس کے آگے ماموں کیا کہتے۔ جب وہ نماز سے واپس ہوتے تو فرو کو موکل کے ساتھ گپ شپ کرتے پاتے۔ کبھی کبھی وہ صبح تڑکے فرو کو پکارتے "ابے آ چلے بے مسجد میں جا رہا ہوں"
وہ چائے کی تھی سی۔۔ کیا ہوا صدرے رہنما میٹھا جی "رے المماں سے جواب دیتا "ابھی تم چلو ـــــ وہ فاخری دادی کو رات اندرہ حیز بیٹھ گیا۔ دل کے لے دو بتی چائے دم کر کے میں ابھی آوں فروٹ، تم چلو سرصاب"
فاخری دادی بڑی جلالی سیدانی تھیں، گھر کے ہر فرد کی بڑی اور بزرگ ۹ سے زیادہ تو اُن کی عمر تھی لہٰذا اُن کو سب کے حالات بھی معلوم تھے ـــــ ہر ایک کی ماں کا مہر اور اس مہر پر جو جھگڑا ہوا تھا، ہر ایک کے باپ چچا کی ڈالی ہوئی دھوں یا تلین، سب کی بڈی کی عمدگی یا تی ـــــ ان کو غصہ چڑھتا تھا تو وہ سات پشت تم کے دھر دیتی تھیں ظاہر ہے ان کی جائے میں کون آ ترکے لگا کے اپنی سات پشتیں تو مُوانا ـــــ ماموں بڑبڑاتے پیر پٹختے باہر چلے جاتے۔
یقیناً فرو کے دل پر مدانے گہری، کافی گہری مہر لگا دی تھی۔
پھر ایک دن گھر میں کافی ہنگامہ ہوا ـــــ بات یہ ہوئی کہ فرو کے پاس ایک جوڑا جوتا کہیں سے آ گیا، جوتا نہیں بوٹ، ایک دم عمدہ والا! جما چم کرتا یا مونواس میں منہ دیکھ لو!

پھر اکیلا جوتا ہی نہیں تھا۔ ساتھ میں ایک ڈبیہ پالش اور برش بھی۔ سب بچے بیحد جوش میں آگئے تھے، کوئی ڈبیہ کو گول گول نچاتا، کوئی برش کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا، کوئی فیتہ کھینچتا ــــــ نوری آپا نے تو یہاں تک تجویز کی کہ اس جوتے کا کوئی نام رکھ دیا جائے، بیرسٹر ماموں بھی اس وقت بڑے عمدہ موڈ میں تھے۔ بولے، "ہاں ہاں، ضرور رکھو ــــــ خدا بخش رکھو اس جوتے کا نام"

سب تو ہنسنے لگے مگر فخرو بے حد سنجیدگی سے بولے، "ابی گے تو ٹھیک کہو ہو میر صاحب گے بخشا تو ہے خدا ہی نے ــــــ میں نے اتی دعائیں مانگی تھیں کہ اللہ میاں تم نے سب کچھ دیا بس اب بوٹ جوتا اور دلوادو کیئں سے ــــــ سو میر صاحب وہ موکل آیا تھا نہ، ابی وہی جن نے اجھاری والی تیزن کی لونڈیا بھگائی تھی اور تم نے وسے صاف چھڑوالیا تھا تو ون نے مجھ سے کیا کہ بھائی جب میں آؤں تھا تو تو میری بہت خاطر کرے تھا ــــــ اب میں با عزت بری ہو کے گھر جا رہیا ہوں تو تا تو کیا لیوے گا۔ سو چٹکی بجاتے میں، چھپڑ پھاڑ کے اللہ میاں نے دلوا دیلے گے بوٹ ــــــ اچھا ہے نہ میر صاب!" اس نے بڑے پیار سے جوتے کو دیکھا۔

"ابے ہاں، بہت اچھا ہے۔" بیرسٹر ماموں بولے، "اب آج تو مسجد چل کر نماز شکرانہ ادا کر"

فخرو چپ ہو گیا جھک کے اس نے جوتے اٹھائے، بڑی احتیاط سے ڈبے میں رکھے، بیچ جوتوں کی آڑ میں پٹ کیا، پھر ڈبیہ ایک کونے میں بٹھائی، ڈھکنا ڈھک کے اسے تسلی سے باندھا، ڈبہ بغل میں دبایا ــــــ اور کھسک لیا۔

شام کو مغرب کے وقت بیرسٹر ماموں مسجد میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ انھیں فخرو کا سایہ گلی میں نکڑ پر دکھائی دیا ــــــ نئے جوتے پہنے، نئی قمیض کا دامن اڑاتا، نئے پائجامہ کے پائنچے پھڑکاتا۔ ایک دوست کے ہاتھ میں ہاتھ دیے وہ گلی میں مڑنے ہی والا تھا کہ بیرسٹر ماموں نے للکارا، فخرو ــــــ ابے او فخرو ــــــ یہاں آ ــــــ ابے آ یہاں۔

فخرو پھنس چکا تھا ــــــ اس کا دوست اور وہ دونوں آئے۔

"چل وضو کر۔" ماموں نے حکم دیا۔

فخرو کسمسا کے بولا۔ "ابی پان کھا رہیا ہوں بالسٹر صاب، اور پھر گے بھی تو بات ہے کہ..."

بکہ پان گے اس کو سسرال والوں نے کھلایا ہے، تھوک نہ سکے ہے بیچارہ۔

اس کے دوست نے ٹکڑا جوڑا۔

ماموں ہنسنے لگے: "سسرال؟ ہے چچکے ہی چچکے یہ سسرال کیسی؟"

فرزو تو چپ رہا پر اس کا دوست بولا، "اجی کوئی ایسی ویسی بات نہ ہے، اشراف ہیں گے وہ لوگ بھی، اپنی برادری ہے ماسٹر صاحب۔ لڑکی بھی قبول صورت ہے گی، نماز پڑھے ہے، کلام پاک ختم کر چکی ہے، ہم لوگوں نے سوچا کہ بیوی کے مرنے سے اس دکھیا کا گھر بھی اجڑ گیا ہے سو بس جاوے گا۔"

"اچھا اچھا ——— وہ دیکھا جاوے گا۔ پہلے تم دونوں آدمی چلو، وضو کرو ——— چلو ———"

ماموں نے اصل بات پر پھر زور دیا۔

فرزو نے بے بسی سے دوست کو دیکھا، دوست نے اُسے دونوں نے باری باری سے مٹی کا بدھنا اٹھایا، وضو کیا۔ مغرب کی نماز کے بعد مولی صاب روز وعظ کہتے تھے، آج بھی کہا ——— فرزو اور اس کے دوست نے کئی بار پہلو بدلا پر ہیڈ ماسٹر ماموں نے ان کو گھورا کہ وہ پھر دبک کے بیٹھ گئے۔

آخر کار وعظ ختم ہوا اور پھر فرزو کو ایک ہی پل بعد معلوم ہو گیا کہ اس کا نیا بوٹ جوتا غائب ہے! سب لوگوں میں ہراسانی پھیل گئی۔ ہیڈ ماسٹر ماموں بھونچکا رہ گئے، ان پر ایک منٹ تو بالکل سناٹا طاری رہا پھر فرزو کو بہلاتے ہوئے بولے۔

"چل جانے دے ——— ہو گا ——— میں ابھی تجھے دوسرا لے دوں گا، وس سے بھی اچھا ——— سمجھ لے جس اللہ نے دیا تھا وہی نے لے لیا۔"

فرزو پر اب تک تو سکتہ طاری تھا مگر یہ بات سن کر وہ بپھر گیا۔ بھنّا کے بولا، "اجی گئے تو میں کبھی نہ ماننے کا ہوں کہ اللہ نے میرا بوٹ جوتا لیا ——— اُن نے مجھے اتنی دعائیں مانگنے پہ دیا تھا، پھر وہ لے کیوں لیوے گا خوامخواہ اللہ کو بیچ میں گھسیٹو ہو ماسٹر صاحب ——— لیا تو ہے کسی نمازی نے۔"

اب ہیڈ ماسٹر ماموں کیا کہتے، وہ تو صاف ہی ظاہر تھا کہ کسی نمازی نے لیا ہے! کھسیا کے بولے، "نہ جانے کون تھا شیطان کی اولاد۔ لوجی مسجد میں نماز کے بہانے آویں یہاں بھلے آدمیوں کے جوتے چرانے ——— ابھی پولیس میں رپورٹ کر کے بند کرواؤں ہوں۔"

پولیس میں رپورٹ ہوئی بیرسٹر ماموں نے انعام کا اعلان کیا، دوسرے دن وعظ میں بڑے مولی صاحب نے بھی خوب لعنت ملامت کی۔ محلے میں بھی ایک ایک سے کہا گیا سنا گیا ——
پر بوٹ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

چوتھے یا پانچویں دن ایک اور واقعہ ہوا۔ مغرب کی نماز کے وقت فخرو مسجد میں پہنچا اور جیسے ہی مولی صاحب وعظ کہنے بڑھے وہ بڑے ادب سے بولا: اجی مولی صاحب، لائے کر میں کچھ کہنا چاہوں ہوں۔

مولی صاحب کو اس سے بیحد ہمدردی تھی، فوراً ایک طرف کو ہوتے ہوئے بولے،
"ہاں بھائی ہاں، کہو کہو"

فخرو لوگوں کو مخاطب کر کے بولا، "بھلے آدمیو، نرسوں یہاں سے میرا نیا بوٹ چوری ہو گیا، نمازیوں کے سوا تو کوئی یہاں آتا نہ ہے سو کسی نمازی نے ہی لیا ہووے گا۔ خیر، پر میں نے سوچا کہ جس مسجد میں جوتا گیا، سو ہوئیں گے پالش کی ڈبیا اور برش بھی چلا جاوے سو وہ میں لیتا آیا ہوں اور آپ نمازیوں کو بخشے دوں ہوں، اللہ سے دعا مانگوں گا کہ ایک بار دیا تھا سو دوسری بار بھی دیوے اور دس کی کرمی سے کچھ دور نہ ہے، دیوے گا اور پھر دیوے گا، ضرور دیوے گا"

اس تقریر کے بعد اس نے اپنے کرتے کی ایک جیب سے پالش کی ڈبیہ اور دوسری جیب سے برش نکالا اور مسجد کے ایک کونے میں اُچھال دیا۔ پھر اپنی پرانی سلیپریں پہنیں اور روانہ ہو گیا۔

جب میں چھوٹی سی تھی تو فخرو کافی بوڑھے ہو چکے تھے، ڈیوڑھی میں پلنگ پر بیٹھے کھانسا کرتے تھے۔ مگر ہر بار جب ہم لوگ ننھیال جاتے تو یہ قصہ ضرور سنتے۔ فخرو دادا سے کبھی پوچھو تو نماز کے ذکر پر تو وہ چپ رہتے پر اگر کوئی کہہ دیتا کہ جی اللہ کا کرنا یوں ہی تھا، تب وہ بہت بگڑتے: واہ جی، اچھی کہو ہو اللہ کا کرنا تھا —— اجی وہ تو دیوے ہے، وہ سے کے کیا کرنا ہے، یہ تو ہے انسان، چھینے تو ہے بندہ —— اور نمازی بندے کی تو جب نیت بد ہے تو ایسی بد ہے ہے کہ جس کی کچھ ٹھیک نہ سمجھے ہے کہ نماز پڑھوں ہوں تو سات خون بھی کو معاف ہو جاویں گے۔ جانے ہے کہ اللہ کچھ کہنے کو آنے سے رہا، وہ گواہی دینے سے رہا، بس اپنی ساری کی کرائی، اگلی پچھلی گوڑی سمیٹی اور اللہ کے سر تھوپ دی۔
کیا انصاف ہے جی —— واہ!

قمر جمالی

یہ بات نہیں کہ سکینہ نے باپ کی شکل
نہ دیکھی ہو کیونکہ جب باپ کو اس نے دیکھا وہ
اس کی اپنی اولاد کی طرح بے بس تھا، ایک ایسے
تناور درخت کی طرح جسے اندر سے دیمک چاٹ
گئی ہو، جس کی جڑیں زمین چھوڑ چکی ہوں۔ اور
جسے آبِ حیات مہیا کرنے والے پتے تو کجا
ٹہنیاں بھی چٹخ چٹخ کر نیچے گر گئی ہوں۔ بےجا
ضد اور لاڈ پیار کو اس نے کبھی اپنا حق نہیں جانا بلکہ
کسی بھی ضرورت کے اظہار سے قبل اس نے
سینکڑوں مرتبہ اسے رد کر کے دیکھا کہ وہ
ضرورت دب ہی جائے تو بہتر ہے۔ مبادا کہ اس
کے اظہار سے اس کے باپ کا اپنی بے بسی کا احساس
اور بڑھ جائے گا۔ یہ تھا سکینہ کا بچپن۔
جوانی؛ جس کے تذکرے ہی سے
لڑکیوں کے رخسار پر حیا کی سرخی ان کے سراپا
کو شفق گوں بنا دیتی ہے، ایسے کسی احساس کو
سکینہ نے اپنے اندر مکمل منتقل ہونے محسوس
نہیں کیا۔ اُلٹا اسے تو ہمیشہ یہی دھڑکا لگا رہا
کہ ـــــ آسمان کا ٹکڑا نہ جانے کب ٹوٹ
کر اس کی ماں کے سر پر گر پڑے جو ایک چیل
مرغی کی طرح اپنے تینوں بچوں کو اپنے پروں کے
نیچے چھپائے، اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں سے آسمان
کو تاکے ۔ مسلسل فریاد کر رہی ہے "الٰہی!
آندھیوں کے بادبانوں کی طنابیں کھینچے رکھ۔
ورنہ یہ پیڑ ذرا سے جھکڑ سے زمیں بوس ہو جائے گا"

ندیشوں سے ہوتی ٹل تو نہیں جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اندیشے درحقیقت آگے درپیش حادثوں کے اشارے ہوتے ہیں جنہیں ہمارا مافی الضمیر ہم سے پہلے محسوس کر لیتا ہے کاش سکینہ کا مافی الضمیر اس کی قسمت کی طرح خوابیدہ ہوتا ___! کم از کم وہ اس قبل از مرگ واویلا والی اذیت سے تو بچی رہتی۔ آگے درپیش موت کو لمحہ لمحہ محسوس تو نہ کرتی۔ مگر نہیں۔ اس کا مافی الضمیر اس کی قسمت کی طرح سرکش تھا۔ بات بات پر کسی انجانے خطرے کا اشارہ دے دیتا۔ تو کسی زخم نادیدہ کو وہ اپنے دل کے اندر رِستا محسوس کرتی۔ لہو کی دھار دل سے نکل کر آنکھوں سے ٹپک جانے کو تیار ہوتی تو وہ اپنے جبڑے مضبوطی سے جکڑ لیتی اور۔۔ غم کی امڈتی باڑھ کو گھونٹ در گھونٹ اندر ہی اندر پی جاتی۔ کتنی بار اس نے سجدہ ریز ہو کے خدا کے حضور گڑگڑایا تھا کہ ان خدشوں اور وسوسوں کی تعبیر اس کے خوابوں کی تعبیر کی طرح الٹی ثابت ہو ___ مگر۔۔ مقدرات اس طرح بدلتی کہاں ہے ___ ساری دعائیں اکارت گئیں۔ اندیشوں نے جیسا نقشہ کھینچا، ہو بہو وہی تصویر نکل آئی۔ وہی پیپل کا کھوکھلا سا۔ بڑا سفید لٹھے کی کفنی ___ وہی دہشت زدہ زمین سے چپکی ہوئی جیسی مرغی ___ اور۔۔ وہی ننھے ننھے چوزوں کی چاؤں۔۔۔ چاؤں

بیس سال گزر گئے اس واقعے کو مگر آج بھی سکینہ کو گزرے کل کی طرح یاد ہے۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا، طوفانِ باد و باراں تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے کہ آندھی کے پہلے ہی جھکڑ پر وہ سایہ دار کھوکھلا سا ڈھے گیا۔ مگر۔ ۔ اس دن ہمیشہ کی طرح اندیشوں سے ڈر مردہ، کسمسا کر وہ ماں کے پیروں میں سمٹ نہیں گئی، بلکہ ۔ تڑپ کر باہر نکل آئی ___ اور درخت کے زمین بوس ہونے سے قبل ہی جھپٹ کر اپنی ماں کو، اس کے پروں کے نیچے دبکے سہمے دو ننھے چوزوں سمیت، سمیٹ کر باہر نکالا۔ اور خود ___؟ آن واحد میں جوان ہو گئی۔ شتر مرغ سی بلند قامت۔

اس دن سکینہ روئی نہیں۔ ماں زندگی بھر بلبلائی تھی۔ ڈری ڈری سی ننھی زندگی کی آنکھوں میں اس دن ۔ بلبلاتی۔ فریاد کے لئے اٹھے ہوئے زندگی کے اُن بے جان ہاتھوں کو اس نے گرنے سے قبل ہی تھام لیا۔ اپنے سینے پر پڑے ڈوپٹے سے اس نے ماں کے سر پر ردا کھینچی۔ چوزوں پر سائبان کیا۔ اور خود ایک چھتنار درخت سی بن گئی۔

اب سکینہ کس سے ڈرتی ___ خود اس کی آنکھیں اتنی بے جلال تھیں کہ زندگی، جو ہر گھڑی

میں جھونک دی گئی۔ ہاں ـــ اس دن سکینہ بہت تلملائی، بہت روئی۔ اور اپنے کندھوں پر اپنا جنازہ اٹھائے ایک اور دنیا میں منتقل ہو گئی۔

یہاں کی دنیا سکینہ کے لئے بالکل انوکھی تھی۔ کیونکہ اس گھر کے لوگ سکوں کی اس ترکٹ بیلی کی چال کو سمجھتے تھے۔ جذبات کی زبان ان کے لئے کوئی غیر ارضی شئے تھی۔ کوئی زر پرست، تو کوئی ظاہر پرست۔ کہاں وہ جہاں کہ جہاں جان کی بازی لگانے میں سبقت دوڑ دوڑی جاتی اور کہاں یہ کہ کوئی جان سے جا رہا ہو تو، کوئی یہ کہہ کے گزر جاتا کہ یہی مناسب وقت ہے اس کے جان چھوڑنے کا۔

اس گھر میں سب سے عجیب شئے اسے اپنی ساس لگی جو کہنے کو تو گوشت پوست کی بنی تھیں مگر ایک دم پتھر کا بت۔ انسان کو تو کیا سمجھتیں خدا سے بھی ان کی شناسائی نہ تھی۔ پڑھی لکھی اتنی کہ پیٹ تو کیا بس کھول کر دیکھو تو کہیں الف نہیں۔ محبت انھیں صرف اپنے آپ سے تھی۔ درد تک خود اپنے جسم پر مار کی اذیت محسوس نہ کرتیں، آنسو کی کیا مجال جو ان کی آنکھوں میں آتے ـــ !
اور دل ـــ ؟ پتہ نہیں ان کے سینے میں دل تھا کہ نہیں ـــ ! اگر ہوتا تو کبھی تو اس کے تڑپنے کی آواز سکینہ نے سنی ہوتی۔ حالانکہ اس درمیان ایسے کئی مواقع آئے بھی۔

بہت جلد سکینہ کو محسوس ہونے لگا کہ اسکو مات ہو گئی ہے۔ اب بہوش سمٹ لینے چاہئیں۔ دن بھر وہ سوچا کرتی کہ ان پتھر کے بتوں کے بیچ وہ لہو لہان ہو جائے گی۔ مگر رات جب طیب گھر آتا تو وہ اسے نرم و گرم گوشت پوست کا انسان لگتا۔ اس کے ہاتھوں کو وہ اپنے ہاتھوں میں لئے الٹ پلٹ کر دیکھتی کہ ان میں خون کی رگیں ہیں ـــ ؟ سینہ پر کان رکھ کر سنتی کہ سانسوں میں اللہ ہو کا ورد جاری ہے ـــ ؟؟ سینے پر سر رکھ کر محسوس کرتی کہ جذبات کے زیر و بم سے دل کروٹ لیتا بھی ہے ـــ !

پھر دن وہ بساط الٹنے کا فیصلہ کرتی اور رات کو بھول جاتی۔ پانچ سال گزر گئے۔ اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس بیچ وہ خود تین لڑکیوں کی ماں بن گئی۔ اپنے ننھے منے نادان چوزوں کی نگہداشت کرتے ہوئے وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ خدا اور سرمرٹ جیسی مرغی کیسے بن جاتا ہے۔ اب تو وہ یہ بھی بھول گئی کہ پتھروں سے چلتے چلتے اس کے تلوے کس قدر لہو لہان ہو گئے ہیں۔ یا یہ کہ ان زخموں پہ کھرنڈ کی جگہ بے حس خول چڑھ گیا ہے ـــ کہ اب ان میں درد ہوتا ہے اور نہ دل کے کروٹ بدلنے کی آواز ہی آتی ہے۔ اور تو اور۔ وہ ابھی دو چھوٹی بہوں کی شادی کے

سکینہ ہارنا چاہتی مگر اب صحن پر اُس کا اختیار باقی نہ رہا تھا۔ جو حال برسوں پہلے اس کے اپنے گھر کا ہوا تھا، اب آہستہ آہستہ وہی حال یہاں کا ہونے لگا تھا۔ خوف، ہراس، یاس، ناامیدی، اختلال اور خدشات ۔ ان سب کے تابڑ توڑ حملوں سے سکینہ جو کبھی ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ تھی ۔۔۔ اب کھنڈر بن گئی تھی ۔۔۔ کہ ذرا سی آواز سے گونج پیدا ہو جاتی ۔ اور گرہستی کے در و بام مرتعش ہو جاتے۔ یہی تو وہ نہیں چاہتی تھی ۔

آخر طیب ہی نے یہ معرکہ بھی سر کیا۔ بہت سمجھا منا کر جھوٹ سچ کہہ کر عارضی طور پر ہی سہی اماں کو ان کے سارے سامان کے ساتھ اپنے گھر منتقل کر لیا۔

اماں کی آمد سے ایک بار پھر سکینہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پچکے گال بھرنے لگے۔ آنکھوں میں زندگی نمودار ہونے لگی۔ سکینہ میں اس تبدیلی کو محسوس کر کے طیب نہال ہو گیا۔ بچے چہکنے لگے، گھر کے در و دیوار گنگنانے لگے۔ مگر ۔ ۔ ۔ سکینہ کی یہ تبدیلی گھر کے ایک فرد کو بُری طرح کھلنے لگی۔ وہ تھیں ۔۔۔ سکینہ کی ساس ۔

"تیری جورو نے اس گھر کو دھرم سالہ سمجھ لیا ہے ۔۔۔ ؟"

"امی آہستہ بولو۔ وہ سن لیں گی ۔ بڑی خوددار خاتون ہیں ۔"

"ہاں ابھی تو داماد کی روٹیاں توڑنے چلی آئیں ۔"

امی کیا غضب کرتی ہیں۔ کھڑے پاؤں لوٹ جائیں گی۔

مری بلا سے۔ میں کیا ڈرتی ہوں ۔۔۔ ؟ توبہ لو یہ کیا زمانہ آگیا ہے۔ ہمارے زمانے میں لوگ جو دلسی کر لیتا ۔۔۔ سد کرتے تھے مگر بیٹی کے گھر رہنا نہیں۔

امی بڑا بول نہ بولو۔ خدا کو برا لگے گا۔ وہ بڑی نیک خاتون ہیں۔

ہاں ہاں ابھی تو بیٹی کی کوکھ سے لے کے بھی ساون دھن پیدا کریں جو نئی موئی ملیں اگادیں ۔۔۔ اور کسی نہ کسی کے منڈوے چڑھا دیں۔

ماں بیٹے کے جھگڑے بس کچھ ہی دن دونوں کے بیچ رہ سکے۔ پھر تو بات ایسی طول پکڑ گئی کہ اماں بھی نہ رہ سکیں جب کبھی سکینہ کی ساس کا غصہ نہ سنبھلتا اور وہ طعنے کو ہموار کرنے میں ناکام ہو جاتیں، تو دیر تک اپنی ماں کے کمرے میں سے بڑبڑاتی نکلتی ہیں اور جاتے جاتے اماں کی طرف رخ کر کے کچھ نہ کچھ بڑبڑاتیں اور دونوں گال رو رو کر سرخ ہو جاتے، ہونٹ ۔۔۔ اماں کو کسی نہ کسی کام میں ملوث دیکھنا تو۔ اماں، سکینہ کی

بیت الخلاء کی موری میں پھنس گیا تھا۔ باہر نکالتے ہوئے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بہت دیر تک اماں
اور سکینہ دونوں روتے رہے۔ کبھی قسمت پر تو کبھی قدرت کی مہربانیوں پر۔

ڈاکٹروں کی امید کے خلاف پیر کی ہڈی یوں جڑ گئی جیسے کبھی ٹوٹی ہی نہ ہو۔ مگر مسلسل چار ماہ
تک پلستر میں رہنے کی وجہ سے پیر میں چلنے پھرنے کی طاقت سلب ہو گئی۔ سکینہ روز پاؤں کی
مالش اور ورزش کرواتی۔ اور دفتر جاتے ہوئے بستر کے پاس ضرورت کی ہر چیز رکھ جاتی۔

اماں کی خلاف توقع سدھرتی حالت دیکھ کر سکینہ کی سانس کے سینے پر سانپ لوٹ گئے
وہ ہر وقت بہانے تلاش کرتیں کہ کس طرح ان کی سدھرتی حالت کو دوسرا رخ دیا جائے۔ کبھی
کبھی اماں کو سوتا دیکھ کر وہ احتیاطاً ان کے سرہانے سے دوپہر کے کھانے کا [illegible]
اور پانی کی صراحی اٹھا لیں ——— اور سکینہ کے گھر آنے سے پہلے واپس رکھ دیتیں ——

اس دن اماں صبح ہی سے بے حال تھیں۔ سکینہ نے آفس جانے سے پہلے ہی انھیں نیند کی
دوا دے دی تھی۔ دو چار گھنٹوں بعد اماں کی آنکھ کھلی اور پانی کی ضرورت محسوس ہوئی تو۔
انھوں نے چھوٹی نواسی کو آواز دی۔

"ارے ——— یہ آپ پانی کیوں لانے لگیں سمدھن ——" سکینہ کی ساس نواسی کا گلاس لئے
اسی طرف آتے دیکھ کر وہ چکرانے لگیں۔

"سمدھن جو بھی ضرورت ہو مجھ سے کہہ دیا کرو ——— میں پوری کر دوں گی۔ بچوں کو آواز نہ دو۔"

"کیوں بھلا؟"

"انھیں غیروں کی خدمت کرنے کی عادت نہیں ہے"

"مگر۔ ۔ ۔ ۔ میں تو کوئی غیر نہیں" اماں تلملا اٹھیں۔

"یہی تو مجبوری ہے سمدھن اپنے اور پرائے میں فرق کرنے کی سمجھ ہی نہیں ہے۔"

شام سکینہ گھر لوٹی تو اماں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا مگر ہزار پوچھنے پر بھی انھوں نے
بتایا نہیں۔ ہاں چھوٹی لڑکی نے سارا ماجرہ دہرا دیا۔

اس رات دونوں ہی سو نہ سکے۔ سکینہ اپنے کمرے میں روتی رہی اور اماں اپنے کمرے میں
کتنی بے بس ہو گئی تھی وہ ——— کہاں وہ شیر جیسا سینہ اور کہاں یہ چوروں کی طرح منہ چھپا چھپا
کے رونا ——— ایک وہ زمانہ تھا جب کر سکتی تھی کہ گھر گرہستی تیاگ دیتی ——— اماں کے لئے جنھوں
نے اپنی جان کی پروا نہ کر کے ٹوٹتے آسمان تلے اسے بروں میں چھپا کے اسے اڑنے کے

اسکی ایک کھے کی ہمدردی کے [illegible]

کب ہجرت کر گیا ـــــ اماں کی زندگی میں کب شام ڈھلی ـــ اور کب رات ہوئی ـــ یا
پھر اماں نے شاید آنکھ ہی اس وقت کھولی ـــ جب زندگی، کسی ویران سے اکیلے مکان کی
خواب گاہ میں چھپر کھٹ پر اکڑوں بیٹھے، کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے ٹکر ٹکر آسمان کو
دیکھ رہی تھی اور سیاہی قطرہ قطرہ روشنی کو نگل رہی تھی بس ذرا ایک جھپکی کہ رات ہو گئی۔

سکینہ نے اپنے آپ کو ٹٹول کے دیکھا۔ وہ خود اسے کہیں نہ ملی ـــــ کہیں بھی
نہیں ـــ شاید رت کا بگولہ بن گئی تھی ـــ یا پھر ـــــ وہ سا نقطہ
جو گولوں سے بنے سوالیہ نشان کے پیچھے سمٹ آیا تھا۔

۲ر ستمبر ۱۹۹۱ء

قمر جمالی

کفن

"اماں ٹھنڈ لگتی ہے"

ماں جی! . . . آپ پہلے پسند کرلیں، پھر قیمت دیکھیں گے۔" اپنے پانچ سالہ بچے کی بات نظر انداز کرتے ہوئے وہ جلدی جلدی مرتبانوں کا ڈھیر الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"اماں بہت ٹھنڈ لگتی ہے" لڑکا بہت کپکپا رہا تھا۔

"ٹھہرنا بیٹا" . . . اس نے کپکپاتے ہوئے لڑکے کو بازو سے پکڑ کر پرے دھکیلا اور مرتبانوں کے ڈھیر میں کھو گئی۔ یہ گوری تھی، کلے من، برتن اور مرتبان بیچنے والی خانہ بدوش عورت۔

پندرہ دن قبل اس نے یہاں پڑاؤ کیا تھا۔ بدنصیبی یوں بھی آنکھیں نکالے اس کا تعاقب کر رہی تھی مگر اس بار اُس نے وہ گھن گرج کیا کہ فضا میں رخنے پڑ گئے اور مسلسل پانچ دن تک آسمان برستا رہا۔ عام زندگی معطل ہو گئی۔ لوگوں نے پانچ دن قبل جو کواڑ بند کیے تو وہ مسلسل بند رہے اور کسی نے باہر جھانکنے کی ہمت تک نہ کی۔ زمین کیچڑ سے لت پت ہو گئی۔ مطلع ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔ ہوا کا جھکڑ چلتا تو ٹھنڈ کے نکیلے دانت ہڈیوں میں پیوست ہو جاتے۔ ہاں مگر منجمد خون کی دھار یخ بستہ زخموں سے بہنے کی بجائے آنکھوں سے ٹپک پڑتی۔

گوری بھی گوشت پوست کی بنی تھی، سردی اُسے بھی ہو رہی تھی مگر اسے اپنا ہوش کہاں تھا . . .! وہ تو فکرمند تھی اپنے لختِ جگر کے لیے جن کے جسم پر نا کافی

لباس تھا۔ پھر سردی تو لحافوں میں دبکے لوگوں کے نام پوچھ رہی تھی اسے اپنے وجود سے نفرت ہوگئی تھی۔آخر کیوں کیا تھا انھیں پیدا اگر وہ انھیں پیٹ بھر کھانا اور جسم بھر کپڑا مہیا نہ کرسکتی تھی۔ ۔۔اس نے سوچا۔

بارش اور ہوا کے جھکڑوں نے بڑی بڑی عمارتوں کے پاؤں ہلا دیئے تھے پھر اس کے کپڑے کے خیمے کی کیا بساط! پچھلی چار راتیں اس نے سڑک کے مقابل بنی تعمیر شدہ بلڈنگوں کے چھجوں کے نیچے بسر کی تھی موسم کے بدلنے سے دونوں بچوں کو بخار ہوگیا تھا بڑا لڑکا حوں توں کرکے سنبھالا لے چکا تھا مگر چھوٹا ابھی تک بخار سے پھنک رہا تھا اسے اپنے آپ پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔ مگر وہ کرے تو کیا۔خود بھی بری طرح کانپ رہی تھی یہ الگ بات ہے کہ اُسے خود کا ہوش نہ تھا فی الحال تو اُسے اتنا ہی ہوش تھا کہ موٹر کار میں بیٹھے بیٹھے استفسار کرنے والی اس موٹی بکری کو کسی نہ کسی طرح پھانسا جائے۔اُس کے ہاتھ برق رفتاری سے کیچڑ میں لتے مرتبانوں کو صاف کرتے رہے اور وہ ایک حاتی کی گڑیا کی مانند دوڑ دوڑ کر مرتبان جمع کرتی رہی۔

"ایسے کتنے مرتبان دے سکوگی۔۔؟" موٹر نشین میم صاحبہ نے خدا خدا کرکے بڑی احتیاط سے اپنا پیر نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔

گوری کی جان میں جان آگئی اور وہ لپک کر موٹر کے قریب پہنچ گئی۔

"اماں ۔۔۔ بدن دکھتا ہے ۔۔ اماں ۔۔۔ اماں سُن تو ۔۔"چھوٹا لڑکا لپک کر گوری کے پاؤں سے لپٹ گیا مگر گوری پر اس کی فریاد کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"اماں۔ ۔میری بات نہیں سنتا ۔۔؟ لڑکا مجسم فریاد بن گیا۔

موٹر نشین میم صاحبہ نے اپنا وقت برباد ہوتا ہوا محسوس کیا اور نیچے اترنے والے پاؤں کو سٹراب سے اندر کرلیا۔گوری کی تو سانس اٹک گئی تقریباً پانچ چھ دن کے بعد ایک گاہک کو اپنے ڈیرے پر دیکھ کر اس کی بھوکی آنتوں کی جلن ذرا مدھم پڑ گئی تھی مگر میم صاحبہ کے تیور دیکھ کر اس کے پیٹ میں الاؤ بھڑک اٹھا۔

"کیا ہوا ماں جی ۔۔۔؟ مارے گھبراہٹ کے وہ بند ہوتے دروازے کے بیچ

حائل ہوگئی۔

"نہیں رہنے دے۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا"۔ میم صاحبہ گوری کو پرے ڈھکیل کر موٹر کا پٹ بند کرنے کی فکر میں تھیں۔

"نہیں ۔ نہیں ماں جی کچھ تو لیتی جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ والا ۔ ۔ ۔ یہ دوسرا والا ۔ ۔ ۔ یہ بہت اچھا رہے گا اس کے تو بیج بھی ہیں"۔ اس نے بھاگ بھاگ کر مرتبانوں کا ایک ڈھیر لگا دیا اس کی دانست میں اب موٹر کا پٹ بند نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ کیا کرنی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ہٹا یہاں سے۔ میم صاحبہ نے ناک سکیڑ کے کہا جیسے گوری انسان نہیں بلکہ سڑک کے بیچ مری پڑی مردار بلی ہے ۔ ۔ ۔ مگر گوری کہاں بُرا ماننے والی ۔ ۔ ۔ ۔ !! افلاس نے تو اُس کی خودداری اور غیرت کو بے مول نیلام کر دیا تھا۔

آپ کے جوا ہماں ہیں آنے دے دینا۔ میرے بچے بھوکے ہیں ۔، وہ گھگھیانے لگی۔

اچھا بتا ایسے کتنے مرتبان دے سکے گی ۔ ۔ ؟ میم صاحبہ نے ایک مرتبان کی نشاندہی کی۔

"آپ جتنے چاہیں"۔ گوری ہر طرح میم صاحبہ کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔

سو ؟ ؟ میم صاحبہ نے سوال کیا۔

"سو مرتبان ۔ ۔ ۔ ؟ ؟ ؟" گوری کی سٹی گم ہوگئی اور حیرانی سے اس کی آنکھیں اتنی پھیلیں کہ اس کے چہرے پہ سوالیہ نشان بن گئیں۔

"میں نے کہا نا یہ سودا یہاں نہیں ہونے کا ۔ ۔ ۔ اب پٹ جانے دے" ایک بار پھر میم صاحبہ کے ابروؤں میں بل پڑ گئے۔

آپ کو سو مرتبان چاہئیں ۔ ۔ ۔ !! گوری اپنی حیرانی دبا نہ سکی۔

"اماں ۔ ۔ ۔ ۔ اماں چھوٹا کپکپا رہا ہے۔ اس کا بدن اینٹھ رہا ہے" یہ اس کا بڑا لڑکا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے اسے اندر ڈیرے میں لٹا دے"، اس نے اپنے بڑے

لڑکے کی اطلاع پر دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور وہ میم صاحبہ کے اور قریب کھسک آئی۔

اماں جی آپ سچ مچ سو مرتبان خریدیں گی ... ؟ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔

"ہاں اس میں اتنے تعجب کی کیا بات ہے؛ میں فوڈ کیٹیرر ہوں کچھ خاص قسم کے کھانے تیار کر کے ملک سے باہر بھیجتی ہوں، اس لیے مجھے اتنے سارے مرتبان ایک ساتھ چاہییں۔ بس اسی سائز کے۔"

ہاں ہاں لے لیں۔ یہ سب لے لیں .... ارے ... آپ سو کی بات کرتی ہیں .... میں تو ... میں تو دو سو مرتبان ایک ساتھ دے سکتی ہوں۔" مارے خوشی کے وہ گڑبڑانے لگی۔ "نہیں نہیں مجھے تو بس سو ہی چاہئیں اور وہ بھی اس سائز کے انھوں نے ایک انگلی کے اشارے سے ایک مرتبان کی نشاندہی کی۔

"ابھی لے لیں"۔ اب گوری کے ہاتھوں میں وہ طاقت آگئی تھی کہ اللہ کی پناہ .. ادوڑتی جاتی اور .. مرتبان اکٹھا رکھتی جاتی تھی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سو مرتبان .. ! ایک ساتھ .. !! اتنے سارے مرتبان ایک ساتھ اس نے کاہے کو بیچے تھے اور پھر سو مرتبانوں کے ایک ساتھ بکنے سے اس کا اچھا خاصا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ مال کی قیمت خرید تو وہ غلے میں ڈال دے گی۔ مگر منافع چھپائے گی اپنے شوہر کو بتا لگنے نہ دے گی اور اس پیسے سے وہ پرانے کپڑوں کے بازار سے اپنے بچوں کے لیے ڈھیر سارے کپڑے اور ... اوڑھنے کے لیے گدڑیاں خریدے گی۔ پچھلے پانچ دنوں میں لوگوں نے شاید لحافوں سے جھانکنے کی ہمت تک نہ کی ہو .. مگر اس کے جگر گوشے کپڑے کے خیمے اور ناکافی لباس سے کس بری طرح سے اینٹھ رہے تھے کتنی خوش ہوگی جب اپنے بچوں کو جسم بھر لباس پہنا دیکھے گی .... اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

"اماں چھوٹو کا بدن بری طرح اینٹھ رہا ہے .... اماں ... اماں سن تو ... چھوٹو مر جائے گا ... اماں" بڑا لڑکا رونے لگا۔

"بیٹا ... یہ کیا میں اپنے لیے کر رہی ہوں۔ یہ سب تو تمہارے لیے ہی ہے۔ جا .. اسے ڈیرے کے اندر لے جا کر سلا دے۔" وہ اپنے بڑے لڑکے کو

ہدایت کرنے لگی۔

"اماں اندر سوکھی جگہ کہاں ہے۔ وہاں دوکان کے چھجے کے نیچے سیٹھ آنے نہیں دیتا۔ آج سب اپنی اپنی دوکانیں صاف کر رہے ہیں۔"

گوری نے سر گھما کر اپنے بیمار لڑکے کی طرف دیکھا۔ لوہے کے ٹھنڈے صندوق پر پڑا وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ دل میں ممتا کا ایک طوفان اٹھا آنکھوں میں بے بسی جھلکنے لگی۔ . . مگر . . . اس نے آنسو ڈھلکنے نہ دیئے اور اپنے ہاتھ صاف کرتی ہوئی اپنے لڑکے کی جانب جانے لگی۔ پتا نہیں پھر کیا ہوا۔ وہ پلٹ کر آئی اور منہ معمولی صورت بنانے لگی کہ کہیں اس کے لڑکوں کی دخل اندازی ان پر گراں نہ گزری ہو۔

"اسے بہت بخار ہے اماں جی . . . اچھا بتاؤ۔ یہ مرتبان کہاں رکھوں . . . ؟"

"اماں . . . اماں سن . . . نہیں تو بہت دیر ہو جائے گی . . . . چھوٹو ٹھٹھر جائے گا۔" بڑا لڑکا اس کے سر ہو گیا۔

مٹا لوں کر۔ اپنی قمیص اتار کر اسے اڑھا دے۔ ابھی آتی ہوں۔ بس یہ مرتبان گاڑی میں رکھنے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ خود سے بے خبر ہو گئی . . . . دوڑ دوڑ کر مرتبان گاڑی کی ڈکی میں جمانی رہی دل ہی دل میں حاصل ہونے والے منافع کا جمع خرچ بھی کرتی رہی کہ کس طرح وہ اپنے بچوں کے لیے ڈھیر سارے کپڑے خریدے گی انھیں جسم بھر سجائے گی۔ ایک لمحے کو اس کے ہاتھ تھرتھرا اٹھے اس خیال سے کہ کیا وہ لمحہ وہ برداشت کر سکے گی جب وہ اپنے جگر گوشوں کو جسم بھر لباس میں دیکھے گی۔ . . . مارے خوشی کے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سانس تیز ہو گئی۔

خدا خدا کر کے جب وہ سارے مرتبان گاڑی کی ڈکی میں رکھ چکی اور میم صاحبہ سے پیسے بھی وصول کر چکی تو اس کی جان میں جان آگئی۔ . مگر اس کے آگے ایک اور مرحلہ تھا۔ ساری رقم الگ کر کے اسے علاحدہ میں ڈالنا تھا۔ اور منافع الگ کرنا تھا۔ اور یہ کام اسے بڑی ہوشیاری سے کرنا تھا کیونکہ اس کا مرد اب آنے ہی والا تھا اور اس کے ہاتھ لگتا پیسہ تو ٹھیکے پر خرچ ہو جاتا تھا پھر مزید مال لانے

کی چکر میں غرق ہو جاتا تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ ہرگز ایسا ہونے نہیں دے گی، منافع کے پیسوں سے وہ صرف اور صرف لباس خریدے گی۔

وہ روپے حساب کر کے جلدی جلدی غلے میں ڈالتی رہی۔ جب سارا حساب کتاب ہو چکا اور منافع کا روپیہ بھی الگ کر لیا تو اُس نے رقم کو آنکھوں سے لگایا اور مٹھی میں دبوچ لیا۔

"اماں... آخر تو نے بڑی دیر کر دی.." اس کے بڑے لڑکے کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

"کیا ہوا بیٹا....؟" اُلٹا وہ اپنے لڑکے سے استفسار کرنے لگی۔

"کیا ہوا... ابھی بتاتا ہوں" یہ اس کا میاں تھا جو بری طرح اس کی پیٹھ پر گھونسے مار رہا تھا وہ بے طرح پٹتی رہی۔ مگر کیا مجال جو ذرا بھی اپنی مٹھی کی گرفت ڈھیلی پڑنے دی ہو اس کی بند مٹھی بند رہی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے بڑے لڑکے نے اپنے باپ سے چغلی کھائی کہ اس نے منافع کے پیسے چھپا کے رکھ لیے ہیں۔ مگر گوری کہاں پگھل بیٹھتی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے جتنا پیٹے مگر وہ بند مٹھی ہرگز نہیں کھولے گی۔ مٹھی میں تو اس کی متاع حیات بند تھی وہ پٹتی رہی.... پٹتی رہی.... پٹتی رہی.... مگر کب تک؟ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ادھ موئی تو تھی ہی ہاتھ چلا نہیں سکتی تھی.. گالیوں پر اتر آئی۔

"چاہے میری جان لے لے۔ مگر میں ہرگز کچھ نہیں دوں گی"

"تو کسی کو کیا دے سکتی ہے، لے سکتی ہے.. آج تو نے میرے بیٹے کی جان لے لی۔ کمینی۔ بدذات.. وہ دیکھ"

"کیا۔" گوری نے دوڑ کر ٹھنڈے صندوق پر ٹھٹھرتے ہوئے اس لخت جگر کو جھوا لوگوں کی کھسر پھسر دیکھی۔.. بس اس کے آگے اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس کی بینائی سلب ہو گئی اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ بے ہوش رہی۔ جب دوبارہ اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے دیکھا کہ اس کا میاں بھی اس کے پاس بیٹھا رو رہا ہے"

"گوری یہ تو نے کیا کیا۔.. اب میں کیا کروں؟ میرے ما... لوا ... رنم

بھی نہیں کہ اس کے کفن دفن کا انتظام کر سکوں۔۔۔ جیتا آدمی تو ننگا بھی جی لے۔۔۔
مگر مر کر تو اُسے جسم پھر پوشاک چاہیئے نا۔۔۔!"
ساری بات گورَی کی سمجھ میں آ گئی۔ کتنا بڑا غضب کیا تھا۔ اس نے۔۔۔!
جس آشیاں کے لیے اس نے تنکا تنکا جمع کیا تھا اُس آشیاں کی ضرورت ہی مر گئی
تھی اب اُسے اور۔۔۔ اور اس کے آگے وہ سوچ بھی نہ سکی۔ غم کا غلبہ اس بار
اس شدّت کا ہوا کہ اس کا سر بری طرح چکرانے لگا۔۔۔ سانس بے ترتیب ہو گئی۔
وہ زندگی جسے حوادثِ زماں کے پیروں تلے روندے جانے کے باوجود اس
نے سمیٹ کے اپنے اندر دبوچ رکھا تھا، کیسے دھواں دھواں اِس کی آنکھوں کے آگے
اڑی جا رہی تھی۔۔۔ کتنی بے بس ہو گئی تھی وہ ۔۔۔ اُس کا اپنا جسم لمحہ بھر میں
کیسا پرایا ہو گیا تھا۔۔۔! وہ اسے ہاتھ ہلانا چاہتی تھی مگر نہیں اٹھا پائی تھی۔۔۔
ایک نظر اپنے جگر کے ٹکڑے کو دیکھنا چاہتی تھی مگر۔ بے بسی کی باڑھ یوں چڑھ
آئی تھی کہ روشنی کے جزیرے ہی زیرآب ہو گئے تھے۔
"گورَی۔۔ اب تو ہی بتا میں کیا کروں۔ ۔۔ کہاں سے لاؤں اتنا روپیہ
۔۔۔؟ غریب تو میں تھا ہی مگر ۔ مر کر تو اس لڑکے نے مجھے ننگا کر دیا۔۔ !!"
"تم رونے کیوں ہو جی۔ ۔ اِس کا انتظام تو میں نے پہلے ہی سے کر رکھا
ہے۔۔۔۔ یہ لو۔۔ !"
پوری طاقت سمیٹ کر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور ابے میاں کی آنکھوں
کے آگے اپنی بند مٹھی کھول دی جس میں سفید لٹھے کی ایک تھان اڑسی پڑی تھی۔

۸ ؍ دسمبر ۸۹ ء

قمر جمالی

"یہ کیا کرتے ہو بھائی ــــ !" میں نے دوڑ کر اس
کا داہنا ہاتھ پکڑ لیا جس کے ناخن تقریباً آدھا
انچ لمبے تھے اور جس سے وہ مسلسل اپنی پیشانی کے
زخم کو نوچ رہا تھا۔ زخم سے خون رِس کر اس کی انگلیاں
لہولہان ہو جاتیں تو وہ بڑا مسرور نظر آتا پھر گھڑی
دو گھڑی میں خون منجمد ہونے لگتا تو وہ پھر وہی عمل
دہراتا۔

"کیا ایسا کرنا ضروری ہے ــــ ؟" میں نے پوچھا۔
اس نے یک ٹک میری طرف حقارت سے دیکھا اور
ہاتھ چھڑانے کے لئے جد و جہد کرنے لگا۔

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا تم بھک منگے نہیں ہو۔
اس طرح اوروں سے بچ کر، لوگوں سے چھپ
کر زخم کریدنے سے کیا حاصل ــــ ؟" میں
نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے
ہوئے کہا۔ اس نے ایک غلط نظر سے میرے
پیکر کا جائزہ لیا اور پھر میری گرفت سے آزاد
ہونے کے لئے جد و جہد کرنے لگا۔

"بے کار ہے تم کامیاب نہ ہو سکو گے۔ اٹھو اور
چپ چاپ میرے ساتھ چلو:" میں نے کہا اور
اس کے چہرے پر اپنی پیشکش کا ردِ عمل دیکھنے لگا۔
میں نے دیکھا میری پیشکش سے اس کے رخسار پر
سرخی نمودار نہیں ہوئی بلکہ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں
خود بخود ہونے لگیں اور باچھیں پھیلتے پھیلتے تمسخر
آمیز قہقہے میں بدل گئیں۔ میں نے سمجھا کہ وہ
بڑا چالاک ہے اور اپنے ہاتھ سے میری گرفت

ہٹانے کے لئے ڈھونگ کرنے لگا ہے۔

"تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔ میں ایک شریف انسان ہوں اور۔ ۔ میرا نام۔ ۔ "

"ماشں ـــــ" اُس نے تیزی سے اپنا دوسرا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ یکایک اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس حالت میں اس کا چہرہ بڑا خوفناک ہو گیا۔ مجھے وحشت ہونے لگی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے ہزاروں سوال کر ڈالے مگر اس کی نگاہوں نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ بڑی دیر تک یوں ہی میرا منہ بند کئے کھڑا رہا اور جب تھک گیا تو خود ہی اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

"کیا حرج ہے ـــــ؟" میں نے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔

"بہت فرق پڑتا ہے ـــــ چاہوں اور ضرورتوں کے جنگل سے مافی اٹھا لائی، ضمیر سے جیرا اٹھایا حس کا آکار دیا اور انا کی لیپ چڑھائی۔ بس یہی پہچان کافی نہیں کیا ـــــ؟ تم بھی اوروں سے کیا مختلف ہو۔ وہی ہتھیار لئے گھومتے ہو۔ اس تین انسروالے ترشول ہی کو میں نے اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا ہے۔ اسے خون پینے کی عادت ہے۔ اگر اپنے جسم کا خون نہ دیا تو یہ ترشول آزاد ہو جائے گا۔"

یکایک موٹر کاروں اور موٹر سائیکلوں کے ہارن کا شور سن کر ہم دونوں ہی نے یکلخت سر اٹھا کے اوپر دیکھا۔ سڑک پر ہماری وجہ سے کافی بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور ٹریفک میں خلل پڑ گیا تھا۔ یوں بوں کی آواز سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں اس کی طرف وہ میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ دونوں ہی کی عقل سلب ہو گئی تھی ایسی جگہ سے ہلتے رہتے۔

"ارے دیکھا کیا ہے۔ مار سالے کو۔ ڈھونگ کرتا ہے۔ سالے ان بھک منگوں نے تو سماج کو کھوکھلا کر دیا ہے۔" پھر وہ طوفانِ بدتمیزی اٹھا کہ الامان الحفیظ۔ پتھروں جوتوں کا ڈھیر لگ گیا۔ پولس آئی اور ہم دونوں کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا۔ زخمی وہ بھی تھا اور زخمی میں بھی، مگر نہ وہ سی کرتا تھا اور نہ میں۔

دوسرے دن سب کی نظریں بچا کر ہم وہاں سے نکل چلے کیونکہ اب اس کے جسم پر کھرنڈ آنے لگی تھی اور وہ شدت سے تجدیدِ ناخن داری کی ضرورت محسوس کر رہا تھا اور میں ـــــ میں اپنے پاؤں کے سیلِ رواں کو منجمد ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ ہم دونوں ہی نے ایک دوسرے کو اپنے فرار کے منصوبے کے بارے میں نہیں بتایا تھا مگر حوالات کی کھڑکی سے کود کر میں نے

ہوں ہی اپنے اطراف کا جائزہ لینا چاہا تو وہ بالکل میرے پاس کھڑا تھا۔"ضرورتیں مشترک ہوں تو رشتے آپ ہی آپ بن جاتے ہیں" میں نے سوچا۔

"چلو ہم ساتھ چلتے ہیں ــــ" اُس نے کہا۔

"کہاں ــــ ؟ کیونکہ میں خود نہیں جانتا تھا یہ چلنا کیا ہوتا ہے۔ میں تو جسموں کو وقت کے سیلِ رواں کے ساتھ بہانے کا قائل ہوں۔

"تمہارے گھر ــــ" اس نے کہا۔

"یہ گھر کیا ہوتا ہے ــــ ؟" میں حیران تھا۔

"مکان . . . مکان . . ." وہ مجھے سمجھانے لگا۔

"مکان ــــ یہ مکان کیا ہوتا ہے ــــ ؟" میں بہت حیران تھا کیونکہ میں جانتا نہ تھا۔

"گھر نہیں سمجھتے ــــ مکان نہیں جانتے ــــ اسمعان تو سمجھتے ہو گا ــــ ؟" وہ اگ بگولہ ہو گیا مگر میں حیران تھا۔ کیونکہ وہ مجھے ایسی باتیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جو میں نے سیکھی ہی نہیں

"اسمعان نہیں سمجھتے ! اسی تسدکو لے کر کھوپی پر جون جنرا ہو رہا ہے۔ تم اخبار نہیں پڑھتے کیا ــــ ؟"

"یہ اخبار کیا ہوتا ہے ــــ ؟"

"کیا ــــ !" اس نے بڑی حقارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"او ہو ــــ میں سمجھ گیا ــــ تاریخ کہو تاریخ ــــ" میں اپنے آپ کو کافی ذہین سمجھتا تھا۔

"یہ تاریخ کیا ہوتی ہے ــــ ؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ جسم وقت کے چکر پر سوار ہو کر گردش کرتے ہیں۔ راستے کی گرد اور سفر کی تکان سے ان کے روپ بدلتے رہتے ہیں۔ اور جسم جب نیا روپ دھارتے ہیں تاریخ بنتی ہے۔"

وہ تاریخ کی اس تعریف کو سن کر پہلے تو الجھا الجھا سا لگا پھر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر اطمینان ابھر آیا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں کے کنارے سکیڑ کر اوپر نیچے سر ہلا کر میری وضاحت کی توثیق کر دی۔

"چلو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اسمعان کیا ہوتا ہے ــــ" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دوڑنے

لگا۔ دوڑتے دوڑتے ہم بستی سے بہت دور نکل گئے تھے۔ اب یہاں سے شاید جنگل یا پھر جھاڑیوں کا سلسلہ
شروع ہوتا تھا۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ اب وہ دوڑ نہیں رہا تھا چل رہا تھا۔ مجھے بڑا مزہ آ رہا تھا
کیونکہ اِن رنگین نظاروں میں مجھے کیا کچھ نہ دکھائی دیتا تھا ——!

"آگے ایک نہر ہے۔ وہاں چلتے ہیں" اُس نے کہا۔

اب پھر اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی میں کسی TOE کی ہوئی مردہ ایکس کی گاڑی کی طرح اس کے پیچھے
لپکا جا رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا اور بڑی بڑی آنکھیں نکالے اندھیرے میں کچھ کھوجنے
لگا۔ پھر یکایک پتا نہیں کیا ہوا اُسے کہ وہ خوش ہو رہا تھا کیونکہ اس کے حلق سے عجیب عجیب
آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ اسی زور سے دبایا کہ میری چیخ نکل گئی اور سناٹے میں دور
تک پھیل گئی۔ دیکھتے دیکھتے بے شمار پرندے اپنے ٹھکانوں سے اُڑ گئے۔ اب خطرناک آسماں پر تیر
ہی پر تھے اور ماحول میں جائیں جائیں'۔

بڑی پُر فضا جگہ تھی۔ بارو سے جھر جھر بہتی ندی کا حل رنگ اور فرش پر حدِ نظر تک
کھالیں —— اور ہواؤں کی لہروں سے سدھے مختلف سُر۔ بیچوں بیچ ایک ٹوٹا پھوٹا
مٹی کا چبوترا تھا جس کے اطراف خودرو بیلوں کا حصار تھا۔ وہ مجھے گھسیٹ کر اُس چبوترے پر
لے گیا اور خود بھی دھم سے گر کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ میں کئی بڑی دیر تک اس کے برابر لیٹا
رہا مگر پھر خیال آیا اِس قدرتی خطے میں یہ مصنوعی چبوترا ——!! اچانک مجھے لگا جیسے برقی
تار بدن سے چھو گیا ہو۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا دور دور تک کوئی نظر
نہ آتا تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہا
تھا، اور میری پریشانی کو محسوس کر کے محظوظ ہو رہا تھا۔ میرے جسم میں خون شدت سے گردش
کرنے لگا اور آنکھوں اور کانوں سے گرم گرم شعلے اٹھنے لگے۔ تناؤ اتنا بڑھا کہ میرے ہاتھ سخت
ہو گئے، میرے ناخن باہر نکل آئے، جبڑے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے اور آنکھیں اُبل پڑیں
میں نے ہزار کوشش کی کہ اپنے حواس میں لوٹ جاؤں مگر نہ ہوا اور میرے ہاتھ بڑھتے بڑھتے
اس کی گردن تک چلے گئے۔ میں نے جوں ہی اس کی گردن پر دباؤ دگنا کرنے کے لئے اپنے گھٹنوں
پر بیٹھنا چاہا میری آنکھیں اُس کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ نہیں وہ مسکرا
نہیں رہا تھا بلکہ مسکراہٹ کی بارش کر رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے اٹھنے والی ٹھنڈی ٹھنڈی
پھواروں سے میرے خون کی گردش مدہم ہو گئی، جسم میں خنکی آگئی اور جسم کا تناؤ کم ہو گیا میرے

ہاتھ کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے اور ناخن اندر دھنس گئے۔ حواس بحال ہوئے تو مجھے شرمندگی ہوئی۔
میں نے اس کے مقابل لیٹ کر دوسری طرف کروٹ بدلی اور خرخٹ سو گیا

دوسری صبح جب میں جاگا تو وہ میرے پہلو میں نہیں تھا۔ میں اٹھ بیٹھا اور گردن گھما گھما کر اسے
تلاش کرنے لگا۔ دور ندی کی سمت سے وہ آتا دکھائی دیا۔ قریب آیا تو بڑا صاف ستھرا دکھائی
دیتا تھا۔ اس نے ایک دھوتی باندھ رکھی تھی، ماتھے پر بھبھوت مل لیا تھا، اس کے سر پر چوٹی اُگ
آئی تھی اور وہ بڑی کریہہ آواز میں مسلسل کوئی راگ الاپ رہا تھا جیسے کوئی اک بارد یکساں دُھن پر بج
رہا ہو۔

رام ــــ! میرے منہ سے نکل گیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چبوترے پر آ کے بیٹھ گیا۔ میں بدک کر ایک ہاتھ دور ہٹ گیا۔
وہ بدستور مسکراتا رہا۔

"اب تم اٹھو اور ندی پہ اسنان کرلو۔ من کی پاکی سے پہلے تن کی پاکی ضروری ہوتی ہے۔ یہاں
براجمان ہو جاؤ" اس نے کہا۔

"میں تیرے بازو نہیں بیٹھوں گا۔ بہروپیا ہے تو ــــ آج تیرے سر پہ چوٹی اُگ آئی ہے اور ۔ ۔ ۔
میں جانتا ہوں تُو نے اس کمنڈل[1] میں کیا ہے ــــ میں تیری چوٹی کاٹ دوں گا"

"وہ پھر اُگ آئے گی" وہ بڑا مطمئن نظر آنے لگا۔

"میں پھر کاٹ دوں گا" میں گرجنے لگا۔

"وہ پھر بھی اُگ رہے گی" پھر اُس نے جھپاک سے آنکھیں بند کرلیں اور اُسی کریہہ آواز میں ماحول
کو ست راگ سناتا رہا۔ میں نے اب اُس سے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا۔ ندی پر گیا اپنے آپ کو پاک
کیا اور لوٹ آیا۔

"آؤ آؤ لالہ دیس ــ" مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اُس نے کہا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ اُسے کیسے پتا
چل گیا کہ میں لالہ دیس ہوں۔

"جیسے تم نے مجھے رام نام دیا" اُسے میرے دل میں اُٹھنے والی لہرات کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ میں نے
فیصلہ کرلیا کہ اب اس کی طرف نہیں دیکھوں گا، اور دل کی تسکین کے سامان کروں گا۔ مگر جوں ہی میں نے

---

[1] : سادھو کے ہاتھ کا پیتل لوٹا۔

چبوترے پر پاؤں رکھا، چبوترہ دو نصف دائروں کی شکل میں شق ہوگیا اور بیچ سے راستہ بن گیا۔ اب ایک طرف وہ بیٹھا رہا اور دوسری طرف میں۔ وہ اپنی آواز میں الاپتا رہا اور میں نے اپنی سانسوں میں آری لگالی۔

بائیں طرف وہ رہ گیا اور دائیں طرف میں ہٹ گیا۔ مگر ایسا کب تک چلتا۔ بہت جلد ہی ہم دونوں بیزار ہوگئے۔ پھر ایک رات ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ محنت کرنی چاہئے۔ دونوں جنگل سے جھاڑیاں کاٹ کر لائے۔ ٹہنیوں کو جھکا جھکا کر بیچ بیچ نصف دائرے بنائے گئے۔ پھر ان پر پتوں اور بیلوں سے سائبان کیا گیا۔ اب دونوں بازو بے حساب سائبان تیار ہوگئے۔

ایک صبح پہاڑوں میں آگ لگ گئی۔ دامن میں بسے لوگ تتر بتر ہوگئے۔ جلے لباس اور سڑے جسموں سے دوڑتے دوڑتے لوگ اس کنج تک پہنچے اور زمین پر بے حساب سائبان سے دیکھ کر چیونٹیوں کی طرح ایک ایک میں ایک ایک نفس گھس گیا۔ اندر ہی اندر ایک کے دو ہوئے اور دو کے چار۔ کچھ اُدھر بھی بٹتا رہا، کچھ اِدھر بھی بٹتا رہا۔ اب تو دائیں اور بائیں دونوں بازو اجاڑ بھی چھپنے لگے ـــــ تاریخ بھی سے لگی۔ جنگل میں منگل ہوگیا۔

مگر اب ـــــ ہمارا دل اچاٹ گیا تھا۔ ہم نے سوچا اب ایک چمتکار کرنا چاہئے۔ دونوں نے مل کر منصوبہ بنایا۔ اپنے اپنے جسموں کو ان ہی کٹے پہاڑوں کی گپھاؤں میں چھپا دیا اور ہوا میں تحلیل ہو کر تماشا دیکھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چبوترے کے دو نصف مل گئے اور ایک دائرہ بن گیا۔

صبح کہرام مچ گیا۔ بائیں بازو نے تمام انگلیوں اور انگوٹھے کو بھینچ کر مٹھی بنائی اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ دائیں بازو نے تین انگلیاں اور انگوٹھے کو ملا کر بیچ کی انگلی کو ہوا میں لہرایا اور اعلانِ جنگ کر دیا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ بائیں بازو والے کہتے کہ ایشور نے سمادھی لے لی۔ اب یہاں رام راج کا مندر بنے گا۔ دائیں بازو والے کہتے وہ پہلے ہی رام کا مندر تھا لیکن مگر اللہ دین اسلام پر تھا۔ وہاں ایک یادگار بنے گی۔ ہاتھ سے ہاتھ بھڑ گیا۔ پھر گردنیں دبوچی گئیں۔ آہ و بکا، چیخ پکار، المدد الغیاث ... رام راج زندہ باد۔ فضا میں جگہ جگہ چھید پڑ گئے۔

لوگوں نے خود ہی اپنے سائبان ڈھالئے۔ دائیں بازو کی انگلیاں بائیں کی آنکھیں اور بائیں کی دائیں نے۔ زمین خون خون ہوگئی۔ لڑتے لڑتے وہ چبوترے پر چڑھ آئے اور وہ دھماچوکڑی مچائی کہ تھوڑا تھوڑا کر کے سارا چبوترہ ڈھے گیا۔ لوگ لڑتے لڑتے بھول گئے کہ لڑائی انھوں نے کب اور کیوں شروع کی تھی۔ "یہ کوئی چبوترہ تھا شاید" کسی نے کہا۔ مگر وہاں کوئی چبوترہ نہیں تھا۔

بہت ڈھونڈا گیا۔ ادھر دوڑا، اُدھر بھاگا۔ آخر تھک ہار کر نڈھال نڈھال خود بھی زمین پر گر گئے۔
مگر سب زخمی تھے۔ کسی کا ہاتھ کٹا۔ کسی کا پاؤں، کسی کے کان کٹے، کسی کی ناک اور کسی کا صرف
جسم ہی جسم رہ گیا۔ آتما گھبرا کر نکل گئی اور کسی کے صرف آتما رہ گئی تو جسم ریزہ ریزہ۔

ہم دونوں اوپر ہی اوپر فضا سے نظارہ کرتے رہے۔ پھر کئی دن بعد کچھ لوگ اُٹھے
جیسے طویل نیند سے بیدار ہوئے ہوں۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ آپس میں علیک سلیک ہوئی اور ایک
دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیوں پڑے ہیں؟ یہ سڑا گلا گوشت
کس کا ہے؟ یہاں کی زمین سرخ کیوں ہے۔؟؟
کچھ دیر بعد وہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے پھر جدھر سینگ سمائی بھاگ کھڑے ہوئے۔

اب ہم دونوں نے سوچا کہ ناٹک کا انجام بھی ہو گیا۔ چلنا چاہیے کیونکہ میرے پاؤں
میں گھنگھریاں اپنے آپ ہی آپ گھومنے لگی تھیں اور وہ بھی بے چین ہو رہا تھا۔ ان جلے جیسے پہاڑوں
کی گپھاؤں سے اپنے سفر پیرا اٹھائے اور اپنی اپنی راہ لی۔

ایک۔ ایک۔ سال مگر زمانے بعد پھر ایک دن اسے سڑک کے کنارے دیکھے اپنی بینائی کے زخموں
کو پٹی لپیٹے پاس سے گزرتا ہوا دیکھ کر میں اُسے پہچان گیا وہ بھی کم حیرت نہ تھا۔ مجھے اپنی طرف آتا
دیکھ کر اس نے خود ہی اپنے ہاتھ روک لئے۔ اور آواز دی۔
"آؤ آؤ جعفر علی۔
آج میں حیران نہیں ہوا کیونکہ اس کی چالاکی کا میں قائل ہو گیا تھا۔ مگر کچھ کہنے کے لئے میں نے جوں ہی
زبان کھولی، اُس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے جھٹکا دے کر مجھے روکا۔
"نہیں بھئی اب میں رام نہیں ہوں جیسے تم لالہ دین نہیں رہے۔ اب لوگ اخبار نہیں پڑھتے محسوس
کر لیتے ہیں۔ اور تاریخیں لکھی نہیں جاتیں آپ ہی آپ بن جاتی ہیں۔ اب لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا
کہ وہ رام ہوں یا لالہ دین۔ جنتا ئی کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ اب تو سب ہی رام ہیں اور
سب ہی رحیم۔ اب میں نے بھی اپنا اصلی روپ دھارن کر لیا ہے۔ جے رحموی۔

۱۸ر نومبر ۱۹۹۰ء

قمر جمالی

مجسّمہ

"فنکار! میرے لئے ایک بھائی بنا دو گے؟"
"کیا کہا ---! دل لگی دل والوں سے کی جاتی ہے؟
"بہت بدتمیز ہو۔ بات کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔"
"ہنس کیوں رہے ہو؟ اپنے کام سے کام رکھو۔ کتنی اُجرت لوگے؟"
"ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں بہت سنجیدہ ہوں۔"
"اُجرت کے لئے مطمئن رہو جتنا مانگو گے اُس سے زیادہ ہی دوں گی مگر کام بہت سلیقے سے کرنا ہوگا۔"
"یہی کوئی تین چار دن میں تیار ہو جانا چاہیئے۔ اب غور سے سنو وہ دراز ہوگا اور شکل میری مشابہ۔ بالکل میرا ہمشکل ہو۔ ایسی پھٹی پھٹی نظروں سے کیا دیکھ رہے ہو؟"
"میں تو سمجھتی تھی کہ فنکار کی نظریں عمیق ہوتی ہیں۔ مگر۔ تم تو بہکی بہکی نگاہوں سے دیکھتے ہو۔"
"کیا کہا --- ! میرے مذاق کو سمجھنے سے قاصر ہو۔ ارے! تو یہاں مذاق کون کرتا ہے --- ! سچ کہتی ہوں فنکار مجھے ایک ہم شکل کی ضرورت ہے۔"
"ہاں ہاں۔ ٹھیک پہچانا۔ ایک بھائی کی ضرورت ہے بالکل بالکل وہی بات ہے۔ تب ہی تو کہتی ہوں نا! دراز قد ہو۔ چوڑا سینہ اور وجیہہ مرد ہو تاکہ وقت پڑنے پر نہ صرف مجھے بلکہ شادی کے بعد میرے شوہر کو بھی اپنے پیچھے چھپا سکے۔"
"فنکار! ادھر دیکھو۔ میری ٹھوڑی پر یہ کالا تل کتنا نمایاں اور خوب صورت

معلوم ہوتا ہے۔ اُسے بھی بالکل اُسی مقام پر ایک تل ہونا چاہیے"
"ہاں ہاں۔ وہی تو بتا رہی تھی۔ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا ہونا چاہیے یہی کوئی تیئیس۔ چوبیس سال۔ اور بال ـــــــ بال ایک دم سلجھے اور باقاعدہ ترشے ہوئے ہوں۔ ناک کسی قدر پتلی اور اونچی ہو۔ میری طرح نہیں میری ناک کا اگلا حصّہ کسی قدر گول ہو گیا ہے جو مجھے بالکل پسند نہیں۔ اب یہ تو بات ہی دوسری ہوئی نا۔ میں اللہ میاں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہوں میری تخلیق میں میرا دخل کہاں ہے؟ مگر اب جو اسے اپنے ہی ہاتھوں بنانا ہو تو اپنی مرضی کے مطابق کیوں نہ ڈھالیں"
"فنکار! مسکراہٹوں کا مفہوم وقت اور حالات کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ تمہارا مسکرانا مجھے ناگوار گزرتا ہے"
"خیر ـــ کوئی بات نہیں ـــ اچھا سنو۔ چہرے پر مونچھ ہونا ضروری ہے۔ مگر ـــ ڈھنگ کی۔ ایسے نہیں کہ قومیت ہی بدلی نظر آئے"
"کیا کہا ـــــ ؟ ہاتھ ؟ ہاں ہاں وہی تو بتانے والی تھی۔ انگلیوں کے پور ایک دم مخروطی نہیں ہونے چاہئیں۔ مخروطی انگلیوں والے تلوّن مزاج ہوتے ہیں۔ سنو سب سے بڑی بات تاثرات ہیں۔ چہرہ گویا برنارڈ شا کا کھلا سماجی تبصرہ ہو"
"اوہو ـــــ تم کارل مارکس کی بات کرتے ہو۔ تمہارا خیال درست ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں مارکس کے نظریات
کو شا نے ہی عام آدمی تک پہنچایا ہے۔ اور میرا ساتھی میری ہی طرح ایک عام آدمی ہو گا۔ اور سنو! ہونٹوں کے کنارے ایسے سکڑے ہوں۔ گویا کہ وہ تھوک رہا ہو۔ میرے منگیتر پر"
"کیا کہا ـــــ ؟ ناانصافی ہے؟ نہیں فنکار! یہی تو حقیقی انصاف ہے۔ اور وہ ـــــ ؟ اسی کے مستحق ہیں۔ پچھلے دنوں انھوں نے میری ماں سے گھوڑے جوڑے کے لیے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔ میری بیوہ ماں اتنی رقم کہاں سے لاتی ـــ! پھر میں نے ہی گھرانے کی عزت بچانے کے لیے خوب روپیہ کمایا۔ اپنے ہاتھوں سے ـــ اپنے بل بوتے پر"

"نہیں جی! اتنے سیدھے سادے طریقے سے اپنی روپیہ، اتنا جلدی اکٹھا کہاں ہوتا ہے ——! میں ماڈلنگ کرنے لگی ہوں —— اور بھی بہت کام ہیں میرے۔"

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے ——!"

"کیا کہا ——! حیرت ہے کس پر —— میری قابلیت پر یا میری صاف گوئی پر —— ؟؟" صاف گوئی میرے خمیر کا جز ہے۔ اور قابلیت ؟ وہ تو میں بہت قابل ہوں۔ نام بھی کتنا خوب صورت ہے میرا ——! شہلا ہے شہلا"

"فنکار! مجسّمے کو دیکھ کر اس کے بے جان ہونے کا شک تک نہیں ہونا چاہئے۔ بس ایسا ہو جیسے مائیکل اینجلو کا ڈیوڈ۔"

• • •

"کام شروع کیوں نہیں کیا —— ؟"

"کل سے کروگے؟ مذاق کی بھی حد ہوتی ہے۔ دیکھو میں بہت سنجیدہ ہوں اوہو ——! اب آئی بات سمجھ میں۔ تم بھی پیسے کے پرستار ہو —— آرٹسٹ ہو کر بھی بھوکے ——!! ارے لعنت ہے ایسی فنکاری پر جو صرف پیٹ بھرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ یہ لو۔ ایک ہزار روپے۔ باقی بعد میں دے دوں گی۔ بس اب دو تین دن میں تیار ہو جانا چاہئے۔"

"جی ہاں۔ ٹھیک سمجھا۔ بہت جلدی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری ماں بھیّا کو دیکھنے سے قبل ہی دم توڑ دے۔"

"نہیں۔ ضعیف کچھ نہیں۔ کینسر ہوگیا ہے۔ ڈیڈی کی اچانک موت اور میری شادی کے التوا نے انھیں موت کی طرف دو چار قدم اور دھکیل دیا ہے۔"

"کیا —— انھیں مجھ سے ہمدردی ہے؟ پھر تو میں تم سے بھی نفرت کرنے لگوں گی۔ کیونکہ یہ ہمدردی بڑی دوغلی چیز ہے! جو بھی شخص اپنے دل میں اس کی ہلکی سی رمق بھی محسوس کرتا ہے، بڑا دوغلا ہو جاتا ہے۔ فنکار! میری نظر میں ہمدردی ایک ایسی گاڑی کا نام ہے جس کے آگے پیچھے دونوں جانب انجن

لگے ہیں ـــــ اور دونوں کے رُخ باہر کی سمت ہیں ـــ مجھے اس کا تجربہ ہے کیونکہ میرا منگیتر اشفاق بھی اسی گاڑی کا سوار ہے ۔ مجھے اُس سے ہرگز کوئی شکایت نہیں کہ وہ اُس گاڑی کی اسٹیرنگ سنبھال نہ سکا۔"

" جی ہاں ۔ آج کل وہ ایک شادی شدہ عورت کے چکر میں ہے ۔ ٹھیک ہی تو کیا ہے ۔ کیونکہ میں تو اس پیار ویار کے معاملے میں بڑی اناڑی ثابت ہوئی ۔ مگر... اب نہیں ہوں اب تو میں نے دنیا داری، بے ایمانی، خود غرضی سب کچھ سیکھ لی ہے ۔ اب اگر میں کسی سے پیار کروں تو کامیاب ہو سکتی ہوں ۔ یہی نہیں بلکہ بنا جہیز کے شادی کے حالات پیدا کر سکتی ہوں ۔"

"کیا پوچھا ـ ـ ؟ نہیں نہیں ۔ وہ اب بھی مجھ سے شادی کرنے سے انکار نہیں کرتا ۔ ارے تو بہ ! اشفاق کے سینے میں انسان کا دل دھڑک رہا ہے ۔ وہ اتنا سیدھا صاف کیسے انکار کر سکتا ہے ۔ وہ تو آج کے دور کا ایک کامیاب مرد ہے ۔"

" جی ہاں ۔ وہ اب بھی راضی ہے ۔ مگر... ایک شرط ہے ۔ وہ یہ کہ کوئی بھائی ہونا چاہیئے ۔ ٹھیک ہی سوچا ہے ۔ ایک بے سہارا ماں کی بیٹی شادی کے بعد پوری طرح ایماں دار بیوی اور بہو نہیں بن سکتی ۔ کچھ کچھ بیٹی بھی رہ جاتی ہے جو سسرال والوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ ہے "

"ارے ـ ـ تم کیسے فنکار ہو جی ـ ! اپنے احساس پر ذرا بھی قابو نہیں ۔ کبھی مسکرا دیتے ہو، تو کبھی پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہو ۔ کبھی میری مانوں کو نظر انداز کر کے دوسری طرف دیکھنے لگتے ہو ۔"

" کیا ! تمہیں میری نگاہوں کی برداشت نہیں ۔"

"خوف ہوتا ہے ـــ ؟؟"

" یہ تم سچ نہیں کہتے فنکار ! بڑی پیاری ہیں میری آنکھیں ! بڑی بڑی چمکتی اور چھلکتی آنکھیں !! ہاں ـــــ اب ان پر یاس و حسرت کے سایے پڑ گئے ہیں ۔ پھر بھی تم تو فنکار ہو نا ـ بے نقاب کر کے دیکھ لو ۔"

○ ○ ○

"ارے تم —! اس دواخانے میں —— ! تمہارا بھی کوئی رہتا ہے کیا— ؟ یہ ... یہ تم ہنسنے کیوں لگے —؟"

"کیا —! میرا چہرہ باگ کا چہرہ جیسا دکھائی دیتا ہے —؟ ! نہیں تو. تمہاری نگاہوں کا دھوکا ہے۔ پچھلی رات باگ کا مجسمہ ساتے رہے کیا— !"

"اوہو! پیلے دھبوں سے۔ ہاتھوں کا رنگ لگ گیا ہوگا۔ مجھے اپنا ہوش کہاں تھا—!"

"فنکار! میری رہی سہی دنیا بھی لٹ گئی۔ میری ماں چل بسیں۔ ابھی کچھ گھنٹوں قبل۔ تب ہی تو رنگا تھا میں نے اپنے ہاتھوں کو۔ ماں کہتی تھیں جب تک میرے ہاتھ پیلے نہیں ہوتے ان کی روح جسم نہیں چھوڑے گی۔ حالانکہ جیسی زندگی کی ایک ایک سانس سو سو موت سے بدتر تھی۔ مگر ان کا خیال غلط نکلا — ہاں ممتا ان سے یوں کہلوا رہی تھی۔ موت تو وقت پر آ ہی جاتی ہے مرتے دم تک انھیں یہی محرومی ستاتی رہی کہ میرے ہاتھ پیلے نہ ہو سکے۔ وہ تو خود سے پیلے نہ ہو سکے مگر... جب ماں جانے لگیں تو میں نے خود اپنے ہاتھوں کو ہلدی میں ڈبو دیا اور کیا کرتی۔ !"

"فنکار! تم رو رہے ہو؟ یہی چھچھورنے مرد مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ بتاؤ کتنا تیار ہوا ہے میرا مجسمہ—؟"

"ٹھیک ہی تو ہے۔ آدھی ہی تو رقم دی ہے اب رہنے دو۔ اُسے مکمل نہ کرو اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے اب کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ میں نے ماں کے جسم خاکی کو اسی دواخانے کے عملے کے حوالے کر دیا ہے۔"

"..اچھا—— اب چلتی ہوں۔"

ہ ہ ہ

اعجاز آرٹ گیلری بے ترتیب پڑی تھی۔ دو دن ہوئے کسی نے اعجاز کو کسی سے بات کرتے نہیں سنا تھا۔ آنکھیں ایک مقام پر ٹھہر گئی تھیں۔ ہونٹ شدتِ غم

سے یکساں لرزاں تھے اور انگلیاں سبک رفتاری سے پلاسٹر آف پیرس میں ہلچل
کر رہی تھیں۔ مسلسل دو راتوں سے وہ اُس ادھورے مجسمے کو مکمل کر رہا تھا۔ ساتھ
کام کرنے والے بار بار اسے ٹوک دیتے۔ مگر وہ تو احساس پروف بن گیا تھا
زندگی کی ہلچل سے بے نیاز۔ کوئی بات اُسے اپنے خیال سے باز نہ رکھ سکی۔
مجسمہ مکمل ہو گیا تھا۔
مگر... اس کا نچلا حصہ مرد کا تھا۔ اس کا اپنا —— اور اوپر کا حصہ عورت
کا تھا۔ گردن اور چہرہ عورت کا۔ شہلا کا چہرہ تھا۔ بھرے بھرے لرزاں ہونٹ،
خاموش جھیل جیسی بڑی بڑی آنکھیں، چھوٹی سی قدرے گول ناک۔ ٹھوڑی پر
کالا تل۔ اور بکھرے ہوئے نیم گھنگھریالے دراز بال --- یہ تھا مجسمہ
شہلا کا مجسمہ۔ — !! ایک عورت کے نا تمام وجود کا مجسمہ !!!

یکم مارچ ۱۹۷۵ء

قمر جمالی

دراصل یہ میرے ماں باپ کا آبائی وطن ہے
جلال آباد۔ شاید چالیس سال بعد میں یہاں آیا ہوں
ویسے بچپن میں ہر سال گرما کی چھٹیاں یہیں گزاری
جاتیں تھیں۔ وہ سنہرے دن وہ رنگین شامیں آج
بھی یاد آتی ہیں تو تھوڑی دو گھڑی کے لئے روح میں
سراوٹ آجاتی ہے۔ مگر میں بھی اوروں کی طرح مجبور
ہوں کیونکہ آج کے اس مشینی دور میں انسان کو
اتنی فرصت کہاں کہ الٹ کر تصورات کی دنیا آباد کرکے
ماضی کے جھروکوں سے تاریخ کے اوراق الٹے۔
آج تاریخ کی کتابیں پڑھتا بھی کون ہے؟؟ حد
تو یہ ہے کہ آج کے انسان کو اپنا شجرہ نسب باپ کے نام
سے آگے ازبر بھی نہیں رہا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی جلال آباد کی جو
میرے والدین کا آبائی وطن ہے۔ مگر بیچ میں
جس کا تذکرہ آگیا جو میری کمزوری ہے۔ اگر میرے
بس میں ہوتا تو میں بستر پہ لیٹے لیٹے کئی بار
خود کو ختم ہوتا دیکھتا۔ پھر پاؤں پاؤں چلتا لڑکھڑاتا
گرتا ـــ پھر جوان ہوتا مگر نہیں جوانی
تو یاد کرکے میں لوٹ کر پھر اُسی جگہ آجاتا جہاں
آج پڑا ہوں۔ ایک بڑے مکان کے فاضل
کمرے میں کسی ایسے پرانے سامان کی طرح جس کے
پہلو جگہ جگہ سے چٹک گئے ہوں، جس کا روغن
جگہ جگہ سے اکھڑ گیا ہو ـــ اور۔ جس کے
خدوخال میں دکھائی دینے سے زندگی کا
سارا رنگ ریاست مسخ ہو جاتا ہو۔

ملستر ایسے غائب ہیں جیسے بھوک کی بات۔ لاکراں کے ملکوں ہی نے انھیں کھرچ کھرچ کر چاٹ لیا ہو۔ اور اب جو باقی بچا ہے وہ انھیں چاٹنے کے اہل نہ رہے ہوں۔

"سلام بڑے میاں" میں اُس وقت چونکا جب کسی نے میرے ماموں میاں کو بڑے ادب سے سلام کیا۔

میرے نانا اس گاؤں کے زمیندار تھے۔ ہمارا گھرانہ بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ اب اس گاؤں میں ہمارے گھرانے کی نشانی صرف ہمارے ماموں میاں تھے جنھوں نے ہزار کوشش کے باوجود گاؤں نہیں چھوڑا تھا۔ انھیں اس حویلی کی دیوار و چھت سے کتنا عشق تھا۔ سردی گرمی برسات ہر موسم کی سختیاں سہہ کر یہاں رہ کر جھیل رہے تھے۔ حالانکہ ان کی اولاد شہر میں بڑے عیش کی زندگی گزار رہی تھی اور انھیں ماموں میاں کو پالنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ تنہا حضرت صاحب کا اتنا بڑا کاروبار ہے کہ اُن کے گھر کے کتوں پر بھی ماموں میاں کی نگہداشت سے زیادہ خرچ آتا ہو گا۔

"بیٹا ـــ یہ معیدین ہے پہچانا ـــ ؟" ماموں میاں نے کہا۔

بہت یاد کرنے پر یاد آیا، ہمارے ساتھ پگڈنڈی پگڈنڈی دوڑنے والا ـــ سال میں ایک بار ان انجان راہوں پر ہمارا گائیڈ محی الدین۔ گاؤں والے تب بھی اس کا نام بگاڑ کر اُسے معیدین ہی پکارتے تھے اور آج بھی جب کہ زمانہ اتنا آگے بڑھ گیا ہے۔

"ارے ـــ تو تم معیدین بیچارہ گئے۔ محی الدین نہ بن سکے ـــ پہچانا مجھے ـــ ؟"

محی الدین اپنی آنکھوں کو پورا سمیٹ کر مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ماضی کے محی الدین میں اور مجھ میں بس ایک قرن کا فرق رہا ہو گا۔ مگر آج ۔ ۔ ۔ آج یہ تفاوت ایک صدی سے بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ جب تک محی الدین مجھے پہچان لیتا، اس کی طاقت برابر کرنے کے لئے اُسے گلوکوز کی پوری بوتل چڑھانی پڑے گی۔ نقاہت کی یہ شکل میرے تصور سے باہر تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج ہمارے بڑے شہروں کے طبی کالجوں میں کمزوری و نقاہت کی صحیح شکل سمجھنے کے لئے طالب علموں کو اپنے تصورات کو زحمت دینی ہوتی ہے۔ اگر ایک بار وہ کسی دیہات کی طرف نکل جائیں تو دیکھیں گے کہ بھوک اور افلاس کے مارے انسان نقاہت کی کس حد کو پہنچ چکے ہیں کہ اگر موت بھی ان کے سامنے مجسم ہو جائے تو وہ پہچان نہ سکیں اور اپنی آنکھوں کے کنارے سکوڑ کر، اپنے لاغر اور سوکھے ہاتھوں

کہہ اٹھیں ـــــ بس ایک روٹی مل جاتی ـــــ!"
بیٹا، یہ عمل وہی ہے۔ شاکرہ بی بی کا بڑا لڑکا تھا آج ماموں میاں ہی نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔
مٹھو جی ـــــ! ! مارے خوشی کے اس نے اتنی زور کی ہانک لگائی کہ میں تو سمجھا کہ زمین کا بوجھ ہلکا ہوا۔ ابھی نہیں وہ تو جوں کا توں کھڑا رہا۔ ہاں مگر اُس کا پیکر بید مجنون کی طرح کانپنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے آگے جوڑ رکھے تھے، اور اُس کی آنکھوں سے یادوں کا ایک قافلہ رواں تھا۔ اُس کے ہونٹوں کے کنارے یوں لرزاں تھے جیسے یادوں سے نکلنے والے اس قافلے کو بھینچ رہے ہوں ـــــ اس کی لرزتی پلکوں کے نیچے ایک طوفان بپا تھا۔ فرطِ انبساط سے مغلوب ہو کر وہ مجھ سے لپٹ نہیں سکتا تھا کیونکہ میں اس گاؤں کے زمیندار کا نواسا تھا اور وہ ہمارے ایک بیگار کی اولاد۔

اب محی الدین رو نہیں رہا تھا۔ ہچکیاں لے رہا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہی ننھی شخصیت! سُتا ہوا چہرہ، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور اس پر موٹے شیشے کی عینک۔ سر پر زرد پگڑی جس کا وزن اس کے سارے جسم سے بھاری تھا۔۔ اب تو پگڑی کا یہ زرد رنگ اس کی رنگت میں سما گیا تھا۔

میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے ایک زرد نہر بہہ رہی تھی اور اُس زرد نہر کے دونوں بازو رخساروں کے استوائی ساحلوں پر الگ سماتا ہو رہا تھا۔ یادوں کا ایک ہجوم اُمنڈا چلا آرہا تھا۔ اور یادیں ـــــ قطرہ قطرہ گاؤں کی پگڈنڈیوں سے ہوتی ہوئی لہلہاتے کھیتوں سے گزر رہی تھیں۔
شاید ان ہی دنوں کی بات رہی ہو گی ـ یہی کارتک تھی اشونی۔ سبز و خنک ہواؤں کی مہک، باجوں گاجوں کے بیچ محی الدین کا وہ سمٹ سمٹ کر چوکی پر بیٹھنا اور ہم لوگوں کا اسے چھیڑنا۔ مگر اُس دن ہلدی میں لت پت ہو کر بھی محی الدین کی رنگت یوں زرد نہ لگی تھی۔
جیسے جیسے ہم بار بار اُسے چھیڑنے لگتے، ہلدی کی تہہ کے پیچھے سے بھی اس کے رخسار سیب کی طرح سرخ ہو جاتے تھے۔ مگر اُس وقت ـــــ ؟ ہاں مذاق تو ہم کر ہی رہے تھے مگر اس وقت کسی یار نے اُس کے کان میں پتا نہیں کیا کہا کہ محی الدین چوکی چھوڑ کر بھاگا۔ بڑی بوڑھیوں نے سمجھایا، منایا کہ یوں، مانجھے کی چوکی سے اٹھنا بدشگونی ہے۔ مگر محی الدین نے تو وہ قسم کھائی کہ پھر لوٹ کر چوکی پر نہ آیا۔ اُس رات ہماری بھی خوب پٹائی ہوئی کہ ہماری چھچھوری حرکتوں سے محی الدین نے چوکی چھوڑی۔ اس رات ہم نے بھی قسم کھائی کہ اب چاہے جتنے دن محی الدین مایوں

میٹھا ہے ہم اُس سے ملیں گے تو بس لال پگڑی ہیں۔

شام کو رات بھر رت جگا رہا۔ گلگلے ملیدہ بنا۔ سب سے پہلی سینی تو ہمارے ہی گھر آئی۔ سینی بڑی خوب صورتی سے سجائی گئی تھی۔ سفید ملیدے پر نرگس جوڑے کے بل ڈورے، بیچوں بیچ چاندی کے ورق میں لپٹے بادام کاجو کے پھول بوٹے، اطراف سے اصلی گھی کا ڈورا۔ مگر ہم نے تو جو ہم نے ذرا بھی منہ سے لگایا۔ ہمارے حصے کا ملیدہ اور گلگلے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ہمیں بھی تاؤ آ گیا تھا کہ آخر اس محی الدین کے بچے کو سوتیوں کی طرح سرمایے کی کیا ضرورت تھی ___ نہ وہ سنہری کرچوں سے اٹھتا، نہ ان کے ڈنڈے ہمارے منھ پر پڑے۔

اُس دن بارات نے آنا تھا۔ پہلے سے طے تھی کہ ہم سارے دوست بالکل ہی سج جائیں کہ جب دولہا کی گھوڑی نسب کر بنی ہوئی وہاں سے گزرے تو اُسے بدکایا جائے۔ پروگرام کے مطابق دھوپ چڑھنے سے پہلے بارات کو اطلاع ملنے سے گزر جانا چاہیے تھا۔ سورج سر پر چڑھ آیا تھا مگر بارات کا کہیں سایہ نہ تھا۔ ہم سب بیٹھے تھے کہ کانا کانوں کی طرف سے چیخ پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ہم سب دوڑے دوڑے محی الدین کے مکان پہنچے۔ وہاں ایک افراتفری پھیلی دیکھی۔ ہر آدمی بدحواس دولہن کے مکان کی طرف بھاگتا نظر آیا۔ ہم سب بھی ہجوم کے پیچھے دولہن کے مکان پہنچے۔ وہاں ہم نے جو دیکھا شاید اُسی کو قیامت کہیں گے۔

شادی کا گھر لگا کچھ عزاخانہ بن رہا۔ مگر شادمانی کی جگہ اب آہ و بکا نے لے لی تھی۔ دولہن سرخ حنائی نقشی سی سمٹی سمٹائی بیٹھی نہیں تھی۔ بلکہ زعفرانی دوپٹا اوڑھے بڑے آرام سے سو رہی تھی۔

"ہائے زُہرہ ___ موئے محمد حسن کے جلے لعینوں نے مجھے سانپ بن کے ڈس لیا۔ ہائے میری بچی"

دولہن کی ماں سینے پر دوہتڑ مار کر رو رہی تھی۔ ہم نے پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ زُہرہ کو کالے ناگ نے ڈس لیا جو پھولوں کی ٹوکری میں بیٹھا ضلع سے بس میں سفر کر کے محمد حسن کو زندہ درگور کرنے آیا تھا۔

پھر جو دولہن کو نہلانے کا وقت آیا ایک شور اٹھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ ہر آدمی سینہ کوبی کر رہا تھا۔ ابھی دولہن کو مہندی کے تخت سے اٹھایا ہی جا رہا تھا کہ محمد بن ریگستان کی آندھی کی طرح اندر گھس آیا اور دولہن پر اُڑھایا ہوا زرد دوپٹا گھسیٹ لیا۔ یہ جادو تھا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے

ہوا ایک کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لوگ حیرت سے بت بنے دیکھتے رہے۔

کئی مہینوں تک مصدّقین کی کوئی خبر نہ ملی۔ پھر سال دو ایک سال بعد وہ لوٹ آیا مگر رہی

اُس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔ شادی کے نام سے جو ننھا انقلاب مصدّقین کی زندگی میں آیا وہ آج

بھی اس کے سر پہ پگڑی کی شکل میں موجود تھا۔ ہاں اب اس کی رنگت نے کچھ زیادہ ہی اُس

رنگ کو قبول کر لیا تھا۔

"بیٹا دیکھو ۔۔۔ تم کہاں کھو گئے ۔۔۔۔۔؟"

بھلا ہو ماموں میاں کا انھوں نے ٹھوکا دیا۔ کیونکہ میں یادوں کے اُس فاصلے کو افق کے پار

اترتا دیکھتا رہا مگر گردِ کارواں نے محی الدین کی آنکھوں میں جو چمک چھوڑی وہ تو میں دیکھنا ہی بھول

گیا۔ کیسا کرب ابھر آیا تھا محی الدین کے چہرے پر ۔۔۔۔ یا خدایا۔ یہ چہرہ ہے یا یادوں کا قبرستان"

میں نے سوچا۔

"اللہ اکبر ۔۔۔۔ تبھی درگاہ شریف سے ملحق مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ ماموں میاں

اپنے سر پہ ٹوپی درست کرتے ہوئے کہنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"میاں۔ حویلی کے صدر دروازے تک تو پہنچ چکے۔ اب بکس محی الدین کو دے دو۔ وہ رکھ دے جائے

گا۔ آج جمعہ ہے نا"

"لائیے علوجی ۔۔۔۔" محی الدین نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"کیا ۔۔۔۔؟" میں چونکا۔

"وزن میں اُٹھاؤں گا ۔" محی الدین نے کہا۔

"تم یہ سوٹ کیس اُٹھاؤ گے ۔۔۔۔؟" میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ میری دانست میں تو یہ بات

بڑی نوب خیز تھی کہ وہ خود اپنا بوجھ کیسے سنبھال لیتا ہے۔ میں نے مسکرا کر اس کے چہرے کی گرد پونچھی عینک

درست کر کے اُس کی ناک پر چڑھائی اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ پہلے محی الدین

کسمسایا، سہما سہما اپنے اطراف کا جائزہ لیا اور پھر ٹھیک ہو گیا۔ مکان کے اندر پہنچتے پہنچتے

وہ بالکل پھرتیلا ہو گیا تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے میرا سامان ایک جگہ قرینے سے رکھا، بڑی بی کو

جو غالباً ماموں میاں کا باورچی خانہ چلاتی تھیں انھیں کچھ ہدایتیں کیں اور بھرتا ہے کا ایک

بڑا سا آفتابہ اور سیلابچی لے آیا۔

"لو میاں۔ وضو کر لو۔ جماعت کھڑی ہو جائے گی۔"

"میں اس میں وضو کروں ——! نہیں ۔ یہ نہیں ہو سکتا" مگر وہ بھی مُصر تھا۔ آفتابہ اپنے ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔ اب میں بھی مجبور ہو گیا تھا۔ کیونکہ جماعت کے شروع ہونے کا مجھے بھی احساس ہو رہا تھا۔

مسجد جاتے ہوئے راستے میں جو بھی دروازہ ملتا محی الدین اس کی تفصیل بتاتا کہ کیسے لوگ بے وطن ہو گئے۔ کیسے سارا گاؤں کھنڈر بن گیا۔

"یہ شہاب الدین کا مکان ہے۔ ان کے تمام لڑکے عرب ممالک چلے گئے۔ کبھی کبھی آتے بھی تھے۔ مگر پچھلے چار سال میں خدا نے انھیں توفیق نہ دی اور دونوں میاں بیوی اپنے لڑکوں سے ملنے کی خواہش لئے اس دنیا سے سدھارے"

"یہ سر سار یڈی کا مکان ہے۔ اس کے سارے لڑکے بیروت میں کام کرتے ہیں"

باتیں کرتے کرتے مسجد پہنچ گئے۔

نماز جانے کے بعد میں اور محی الدین گاؤں بھر کر دیکھتے رہے۔ گھومتے گھومتے چوپال پہنچے۔ وہاں بھی وہی سناٹا ۔ وہی خاموشی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ دنیا کی یہ کون رسم ہے کہ جہاں پیر رکھنے کو جگہ نہ ہو، آدمی اسی میں پیر سمیٹ کر سمانے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ خود کو سمیٹتے سمیٹتے اس کا اپنا قد بھی گھٹ گیا ہے۔ کتنی زمین ہے جو ابھی دیہاتوں میں بنجر پڑی ہے —— اور کتنے گھر ہیں جو بے مکین کھنڈر ہیں ——!

"اب یہاں کوئی نہیں آتا" میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ محی الدین تاڑ گیا، اور اپنی بات کو جاری رکھتا ہوا گویا ہوا —— "برتن ہوں گے تو آپس میں ٹکرائیں گے بھی، اور ٹوٹیں گے بھی۔ لوگ ہوں گے تو جینے کی دوڑ میں حصہ بھی لیں گے —— گریں گے بھی۔ اور سبقت لے جانے کی فکر میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچیں گے بھی۔ اب یہاں نہ لڑائیاں ہوتی ہیں —— اور نہ تحصیلدار چاوڑی میں بیٹھا فیصلے سناتا ہے —— اور . . . نہ چوپال پہ بیٹھے لوگ شام کے وقت ان مقدموں پر تنقید و تبصرے کرتے ہیں"

محی الدین کی زبانی اتنی لمبی چوڑی تقریر سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔

"پھر —— یہ مکانات —— یہ بند دروازے —— "اکھاڑ کیوں نہیں پھینکتے انھیں۔ بند دروازوں کے پیچھے سے یہ دیواریں کتنی ہولناک کہانیاں سناتی ہیں۔" دروازے اکھاڑ دو دیواریں گرا دو۔ کم از کم یہ گاؤں کھنڈر کی شکل آثار قدیمہ کے ریکارڈ میں تو زندہ رہے گا ——!

"تم چپ رہو جی علوجی ـــــ" محی الدین نے اس بُری طرح مجھے جب کرایا کر بیں اُس سانس بیں آگیا۔ مگر دوسرے لمحے محی الدین کو اپنے پیروں پہ گرا ہوا پایا تو۔ بچپن کی ہزاروں کہانیاں پاؤں جلتے بچوں کی طرح گرتی پڑتی ، ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتی میری نگاہوں کے سامنے سے گزرنے لگیں۔
جذبات میں بہہ کر میں نے دیکھا ہی نہیں کہ میری باتوں نے محی الدین کے چہرے سے کتنی زندگی چھین لی ۔ یہ محی الدین کی پرانی عادت تھی کہ جب کبھی اُسے میری کوئی بات ناگوار گزرتی وہ اُسی لڑتے ہوئے انداز میں مجھے جھڑک دیتا ـــــ "تم چپ رہو جی علوجی" اور پھر خود ہی اسی غلطی کو محسوس کر کے پیروں پر گر جاتا اور معافی مانگتا ۔
آج بھی اتنے برس بعد ـــــ محی الدین بالکل نہیں بدلا تھا میں نے اسے اٹھا کر اپنے برابر بٹھایا ، ادھر ادھر کی باتیں کیں ۔ اتنے میں پتا نہیں کیا بات ہوئی کہ محی الدین مجھے وہیں بیٹھا چھوڑ کر دوڑتا ہوا گاؤں کے مکھیا کے پاس گیا اور اُردو اخبار اٹھا لایا ۔ بس اس دن سے یہ معمول بن گیا کہ شام کی چائے کے بعد ہم دونوں چوپال پہنچتے ، محی الدین اخبار لے آتا اور میں اسے سرخیاں پڑھ پڑھ کر سناتا میں نے محسوس کیا کہ محی الدین کو بہت اعراف جنگ کی خبروں میں حد درجہ دلچسپی لیتا ہے ۔ جب تک ساری خبریں نہ سن لیتا کسی چھوٹے بچے کی طرح میرے بازو اکڑوں بیٹھ جاتا جیسے میں اخبار نہیں پڑھ رہا بلکہ سامنے دودھ پیڑے رکھے فاتحہ پڑھ رہا ہوں اور وہ ـــــ پیچھے سے بچے کی طرح بے صبری سے بار بار ٹھوکا دے رہا ہے۔ "فاتحہ چھوٹی پڑھو ۔
حویلیاں سے حویلی پہنچے ہوئے وہ بس ایک ہی سوال کی گردان کئے جاتا کہ اب پر لٹے پٹے لوگ جو ساری جوانی داؤ پر لگا کر برس ایسی جاں منتظی ناپی دنیا ئے لوٹ رہے ہیں تو ان کا کیا ہوگا ـــــ ، "کبھی تاؤ میں آجاتا تو کہتا" ان غداروں کے ساتھ یہی تو ہونا تھا ۔ جوانی کا سارا پسینہ دیار عرب میں حدب ہوئے دیا ۔ اب جو سر چھپانے پہ بن آئی تو مادر وطن کا آنچل ہی ملا نا ـــــ ؟"
پھر بڑی دیر تک کُڑ کُڑاتا رہتا ۔ کبھی بیرونِ ملک کام کرنے والوں کو گالیاں دیتا ۔ کبھی ترس کھاتا ۔ مجھے یہ سب سن کر بڑا مزہ آتا اور شاید مجھے اس کی عادت ہو گئی تھی ۔ کبھی وہ چپ ہو بھی جاتا تو میں ہی اُسے چھیڑ دیتا ۔
۔ ۔ مگر اُس دن اسے بڑا تاؤ آگیا تھا ۔ وہ بلاوجہ ہی گاؤں کے نوجوانوں

کو کو بننے دے رہا تھا کس طرح انھوں نے زندہ سلامت گاؤں کو کھنڈر بنا دیا۔

"صبح کا بھولا اگر شام گھر لوٹے تو اسے بھولا نہیں کہتے محی الدین۔ یہ لوگ قسمت کے ستائے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ ہمدردی روا رکھی جانی ہے۔ ابھی دیکھو ہماری حکومت نے کیسے بڑھ کے ان کے لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دیا ہے۔ ایسی طرح طرح کے ترغیبات منظور کیے جا رہے ہیں اور تو اور شہر کی کچھ سرکردہ شخصیتوں نے مل کر ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ جہاں امداد کے ذریعہ جمع کی گئی رقم ان مظلوموں میں بطور قرضہ حسنہ تقسیم کی جائے گی۔"

"تم نے بھی اس میں اپنا حق ادا کیا ہوگا ماموں ــــــــ؟" اس نے پوچھا مگر جواب کا انتظار کئے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا حویلی پہنچا۔ اُس دن وہ بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس دن کے بعد میں نے اس کے چہرے پر بیرونِ ملک کام کرنے والوں کے خلاف نفرت نہیں دیکھی۔ اگر کبھی میں ہی کچھ کہہ جاتا تو وہ جھڑک دیتا ــــ

"تم چپ رہو جی ماموں ـــ" میرا پاؤں پکڑتا اور ہاتھ جوڑ کے کہتا۔

"صبح کا بھولا اگر شام گھر لوٹے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

مجھے یہاں آئے پورے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ ان پندرہ دنوں میں جہاں میں نے ہر دن تقریباً دو گھنٹے ماموں میاں کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے راضی کرنے میں صرف کئے تھے وہیں ایک آدھ گھنٹہ محی الدین کو منانے میں بھی۔ میں گاؤں کے سناٹے اور بھولیاکی سے اس قدر پریشان تھا کہ اکثر سوچا کرتا جہاں کسی کی موت کی اطلاع ملی کہ ماموں میاں اور محی الدین کے پیروں میں چکر لگ جاتی ہیں۔ اگر جو کبھی اکیلے کے ساتھ یہ حادثہ ہوا ــــ؟؟ اس کے آگے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے ماموں میاں تو راضی ہو گئے فی الحال عارضی طور پر ہی سہی مگر محی الدین اپنی ضد پر اڑا رہا۔

"حویلی کی ان دیواروں پر میرے بہت سے احسانات ہیں علو جی۔ کیا ان آخری ایام میں یہ مجھے سہارا نہ دے سکیں گی ــــ! اور پھر اب جب کہ میری زندگی کی گاڑی سیٹی دے چکی، میں خود کو اس کھنڈر کے معماروں میں شامل ہونے نہ دوں گا۔ اور جیسا کہ آپ نے کہا جو کبھی آثارِ قدیمہ کے ریکارڈ میں اس گاؤں کا نام آیا تو جیتوں کو دیکھ ہی شہر خموشاں کی آبادی کو دیکھ کر تو اندازہ لگایا جائے گا کہ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی یہ کھنڈر کتنا آباد تھا ــــــ!!"

محی الدین نے میری باتوں کا غلط مطلب اخذ کیا تھا۔ مجھے افسوس ہوا مگر میں بھی کیا

کرتا، میرے سینے میں دھڑکتے اس حساس دل نے مجھے مجبور کر رکھا تھا۔ میں اپنی کوشش میں ڈٹا رہا۔

ہماری حویلی کے مقابل ایک نہایت بوسیدہ سا مکان تھا جس کی دیواروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ برسوں سے لمسِ انسانی کی لذت سے محروم ہیں۔ مگر ہر دن سرِ شام ایک بڑھیا ہاتھوں میں مٹی کا برتن لئے دیوار سے لگے چبوترے پر نمودار ہوتی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ شام کا کھانا کھاتی اور مغرب کے ساتھ اندر چلی جاتی تو دوسری سہ پہر کو نمودار ہوتی۔ اس بڑھیا کی موجودگی کا احساس کر کے مجھے وہ مکاں آباد کبھی نہ لگا بلکہ مزید پر اسرار ہی لگتا تھا۔ کبھی کبھی تو اس طرف نظر جاتی تو وہ دہشت ہونے لگتی جیسے وہ زندہ انسان نہیں بلکہ کوئی بد روح ہے۔ محی الدین نے بتایا کہ وہ کشتما ہے۔ اور زندہ انسان ہے۔

اُس روز سرِ شام کشتما چبوترے پر دکھائی نہ دی۔ مگر اس کے گھر میں بڑی رونق ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی ساری آبادی سمٹ کر کشتما کے کھنڈر میں جمع ہو گئی۔ نہ ذات نہ پات سبھی دوڑے دوڑے کشتما کے آخری سفر کی تیاریوں میں شامل رہے۔ اس دن محی الدین کے چہرے پر جو بشاشت اور زندگی دیکھی پھر کبھی نہ دیکھی۔ بڑا خوش تھا اور چہک چہک کر کہتا تھا۔

"تم نے دیکھا طوجی۔ موت سفر کتنا خوب صورت ہوتا ہے —— ! گاؤں میں کتنی آبادی ہو جاتی ہے —— !"

"ہاں دیکھا تو ہے —— اتنے تزک و اہتمام سے کسی کو رخصت کیا جاتا ہے —— کشتما کا وقتِ سفر دیکھ کر ہمیں مرنے کی خواہش ہوتی ہے۔"

"تم چپ رہو جی طوجی —— زبان کڑوی نہ کرو۔"

محی الدین نے اس زور کی جھاڑ پلائی کہ میرے سر پر سوار جذبۂ شاعرانہ ہرن ہو گیا۔ مگر کشتما کی موت سے مجھے ایک فائدہ ہوا۔ محی الدین عارضی طور پر ہی سہی ہمارے ساتھ شہر چلنے تیار ہو گیا۔ ہم لوگوں نے دوسری صبح ساڑھے دس کے بس پکڑنے کا فیصلہ کیا۔

اس رات وہ سوتا نہ تھا۔ آدھی رات سے زیادہ ہو گئی مگر وہ یہاں وہاں کی ہانکتا رہا۔ ماموں میاں بھی کچھ دیر ہماری محفل میں شامل رہے پھر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ مگر محی الدین کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ نہ خود سوتا تھا اور نہ مجھے سونے دیتا تھا۔ پھر میں نے اصرار کیا کہ اب سو جانا چاہئے تو وہ مجبور ہو گیا۔ بادلِ نخواستہ اٹھا، کمرے سے باہر چلا گیا۔ پھر لوٹ

آیا۔ میں نے پوچھا بھی۔ اس نے کچھ بتایا نہیں۔ چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔ مگر۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ گیا نہیں بلکہ دروازے سے لگا کھڑا رہا۔ میں نے آواز دی، وہ اندر آگیا۔ ہزار پوچھا مگر کچھ بتاتا نہ تھا۔ وہ پھر مڑا۔ اس کے قدم اتنے وزنی ہو گئے تھے کہ اٹھتے نہ تھے۔ جیسے وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے پھر آواز دی۔ وہ پلٹ آیا۔

"تم ضرور یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم میرے ساتھ نہیں آسکتے۔ دیکھو محی الدین تم مستقلاً تھوڑے ہی گاؤں چھوڑ رہے ہو۔۔۔ پسند نہ آیا۔ لوٹ آنا۔

"یہ بات نہیں علو جی۔۔۔" اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔

میں نے روشنی بڑھائی۔ دیکھا اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

"میں ہار گیا محی الدین۔ اب میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ہاں جب کبھی تم محسوس کرو اور تنہائی کا احساس ہو چلے آنا۔ تم جانتے ہو میں نے ہمیشہ تمہیں اپنا دوست سمجھا ہے۔"

"یہ بات نہیں علو جی۔۔۔" پھر اس نے اسی کمر ٹٹول کر ایک چھوٹی سی پوٹلی نکالی اور میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

"یہ۔۔۔ میری زندگی بھر کی پونجی ہے۔۔۔" اس کی آواز برابر نکلتی نہ تھی۔ دونوں ہاتھ جوڑے میرے آگے وہ دوزانو بیٹھ گیا۔

"مدرانہ۔۔۔۔۔! مجھے۔۔۔!! آج بھی تم اسی دور میں سانس لیتے ہو محی الدین۔ کیا تم مجھے آج بھی اسی دور کا زمیندار شمار کر رہے ہو۔۔۔؟'

"نہیں علو جی۔ وہ بات نہیں۔ تم نے کہا تھا شہر میں ایک امدادی ادارہ قائم ہے جو کوسن سے لوٹے مظلوموں کی مالی مدد کرتا ہے۔ اس کی نذر کرنا۔ یہ میری زندگی بھر کی کمائی ہے۔ اور۔۔۔ اور یہ بات نہیں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں آرہا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ حق زندگی ادا کرنے کا یہی ایک راستہ نہیں کہ زمین کا حق ادا کر دو۔ مٹی کی کایا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے کہیں بھی جاؤ پھر بھی جائے گی تو زمین ہی میں نا۔۔۔"

اُس نے بڑی مشکل سے اتنا کہا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

میں نے گرہ در گرہ پوٹلی کھولی۔ محی الدین کی ساری عمر کی پونجی تھی چار سو اکتالیس روپے پچھتر پیسے۔ یکایک ہی کتنا قد آور ہو گیا تھا ننھا سا محی الدین۔۔۔۔ ساری رات میں بیٹھ نہ سکا۔ جیسے ہی زمیں پر ٹکنے کی کوشش کرتا محی الدین کا قد آور پیکر میرے آگے مجسم ہو جاتا

قمر جمالی

"ماتا بھوانی! مجھے شکتی دے، اور اُن
سینکڑوں مزدوروں کو جو میرے ساتھ ہیں انھیں
حوصلہ دے۔ یہ سچ ہے کہ میرے حوصلوں سے
بندھی ان کی امیدیں اُن کی زبانوں پر تالا بن گئی
ہیں مگر ـــــ مگر میں ان کی خاموش زبان جانتا
ہوں۔ آج میٹنگ ہال میں ان کی سرد مہری اس بات
کی گواہ ہے کہ اپنے بچوں کو بھوک سے تلملاتا ہوا
دیکھ کر اب ان کے حوصلے ٹوٹنے لگے ہیں ماتا۔
تو شکتی مان ہے ـــ جو بھی تیری شرن میں خلوصِ
دل سے آیا، تو نے اُسے بلوان بنا دیا۔ آج
میں بھی تیری شرن میں آیا ہوں ـــ صرف اپنی
طرف سے نہیں ان سینکڑوں مزدوروں کی
طرف سے بھی جو پچھلے دس دن سے انتظامیہ کے سنگدل رویے
کے آگے فولادی دیوار بن گئے ہیں۔ ماتا ـــ آج
میں تجھ سے ایک ایسا شستر مانگنے آیا ہوں
جو شاید کسی نے بھی تجھ سے کبھی نہ مانگا ہو۔ ماں
ہمیں ایسا ہتھیار دے جس سے ہم بھوک کو شکست
دے سکیں۔ پھر ـــ پھر دیکھتے ہیں یہ انتظامیہ
ہمارا کیا بگاڑے گا۔ یہ تو بس اسی انتظار میں ہے
کہ کب ہمارے پیٹ کی آنچ ہمارے دامنِ
ضبط کو جلانا شروع کرے! ہمیں شکتی دے ماں
کہ ہم بھوک پر قابو پا سکیں۔"

بھوانی شنکر ایک مزدور لیڈر تھا۔
پچھلے پندرہ دن سے وہ انتظامیہ کے خلاف ڈٹا
تھا۔ دس دن پہلے اس نے مزدوروں کی طرف

سے انتظامیہ کے خلاف ہڑتال کی نوٹس دے دی تھی۔ اس کی امید کے خلاف انتظامیہ بے حد سنگ دل نکلا مزدوروں میں اب بھوک سہنے کی تاب ٹوٹنے لگی تھی ان کے جسم پر ابھرتی رگوں کا تانا بانا اور آنکھوں میں مایوسیوں کے سائے لہراتے دیکھ کر بھوانی شنکر کے حوصلے پست ہونے لگے تھے۔ اپنی بات ہوتی تو وہ چپ ہو جاتا۔ مگر یہ تو سیکڑوں مزدوروں کے مقدر کی بات تھی۔

وہ ایک نیک اور ایماندار مزدور لیڈر تھا۔ مزدوروں کے ساتھ مزدور بستی میں رہنے والا آزاد ہندوستان کی سوشلسٹ پالیسی کی چال پر اسے اتنا افسوس تھا کہ وہ سوچتا ہی رہ گیا کر کیا یہی وہ آزاد ہندوستان کا حلیہ ہے، جس کا خواب دیکھتے دیکھتے کئی عاشق دار پر چڑھ گئے۔ کب تک یہ کیپٹالسٹ (CAPITALIST) سوشیلزم کے نام پر مزدوروں کے حقوق کا استحصال کرتے رہیں گے ـــ اور۔۔۔ اُن کے خون پینے سے اپنے محلوں کی مٹی گوندیں گے۔؟

اس سے پہلے بھی کئی بار اُس نے مزدوروں کو ان کے حق دلانے کی کوشش کی تھی مگر کچھ ہی دور چل کر خود مزدوروں ہی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس بار اُس نے ان کے ارادوں میں ایسے حوصلے کا فولاد بھر دیا تھا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہرگز انھیں پیچھے ہٹنے نہیں دے گا۔ کیونکہ اُسے اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ مزدور اگر ایمان دار اور بلند حوصلہ ہو تو، ایک طاقتور اکائی بن سکتا ہے۔ انتظامیہ کا کوئی ہتھکنڈہ اس کے قدم ڈھیلے نہیں کر سکتا۔ مگر۔۔۔ مگر ایک بھوک ہے جو ابھی تھوڑی ہی دور چلا کہ اس کے قدم اکھاڑ دیتی ہے۔ اس کے ولولے سرد کرتی اور حوصلہ توڑ دیتی ہے۔ پارٹی آفس کے دفتر سے ہوتا ہوا وہ کالی مندر گیا، وہاں ماتا کے حضور ایک عجیب ہتھیار کی عرضی لگائی اور واپس اپنے مکان کے پچھواڑے کھٹیا پر بیٹھا وہ دن بھر کے گزرے لمحوں کو یکجا کر کے آئندہ کے لئے لائحہ عمل مرتب کرتا رہا کہ یکایک کسی آواز پر وہ چونک پڑا۔

"کون ـــ؟" پاس کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔

"میں ہوں۔ بھوک۔" ایک نحیف سی آواز آئی۔

"ہائیں۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔!" حیرت سے اُس کی عقل سلب ہونے لگی تھی۔

"ہاں۔ تم ٹھیک سن رہے ہو۔ میں بھوک ہوں۔"

بھوانی شنکر حیران تھا کہ آج تک تو وہ صرف بھوک کو محسوس کرتا آ رہا تھا۔ آج یہ کیا ہو گیا۔ ابھی تو وہ اسی کو شکست دینے کی بات سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کیوں نہ آزمایا جائے دو دو باتیں ہو جائیں۔

"اے بُوا بھوک ـــ تم ہو یہاں ـ ؟" اس نے اپنا پیٹ پکڑ کر پوچھا۔

"ہاں ہاں کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو ـــ ؟"

"تم ـــ تم یہاں کب آئیں ـــ ؟" کیونکہ ناانصافیوں کے خلاف لڑتے لڑتے، اپنی مانگوں کو منوانے بھوک ہڑتال کرتے کرتے اُس کے پیٹ کی چمڑی اتنی سخت ہو گئی تھی کہ وہ سمجھتا تھا بھوک اُس کے پیٹ پر چٹکی بھی نہیں کاٹ سکتی۔ مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو بول بھی رہی تھی۔ وہ اپنی حیرانی دبا نہ سکا اور وہی سوال دہرایا۔

"یہ تو میرا گھر ہے۔ میرا آنا نہ آنا کیا ـــ !" بھوانی کے سوال پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"پھر بھی۔ ابھی تک تو تم یہاں نہیں تھیں۔ پھر اچانک آمَن کہاں سے۔ ؟" اپنے پیٹ میں اٹھتی ہوئی جلن کو دبانے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"میں اسی بستی میں رہتی ہوں۔ پہلے بھی یہاں اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ مگر جب سے مزدوروں نے ہڑتال شروع کی یہ بستی میرا مستقل ٹھکانہ بن گئی ہے۔ سچ پوچھو تو۔ آج کل یہاں کام بھی بہت رہتا ہے، اور مزہ بھی خوب آتا ہے!" اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"کام ـــ تم کام کیا کرسکتی ہو ـــ ؟" بھوانی اپنی حیرت دبا نہ سکا۔

"مجھے تمہاری طرح قافلے بنانے کا شوق نہیں ہے۔ اپنی ذمہ داریاں میں اکیلی ہی بانٹتی ہوں یہی دیکھو۔ میں ٹھہری اکیلی ـــ اور اس بستی کا ہر پیٹ میرے ناز سہنے کے لئے اتاؤلا ہو رہا ہے۔ کبھی اِس پیٹ میں تو کبھی اس پیٹ میں۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ دن رات کی دوڑ دھوپ سے میں نڈھال ہو گئی ہوں!"

"خیر یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ مگر۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہیں مزہ بھی آتا ہے۔ بتاؤ تو بھلا وہ کیسے ـــ ؟"

"بھائی! مزہ میرے استقبال کا۔ میری مہمان نوازی کا۔ مان گئی اس بستی کے مکینوں کو پچھلے دس دن سے وہ مجھے مہمان کئے ہوئے ہیں مگر کیا مجال جو ذرا اُن کے ماتھے پر شکن آئی ہو ـــ وہی پُرسکون چہرہ ـــ وہی ہمت اور وہی حوصلے۔ ایک وہ بھی بستی ہے جہاں ایک پل مجھے ٹھہرنے نہیں دیا جاتا۔ بس یوں گئی کہ یوں بڑھا دیا۔ نہ خاطر نہ تواضع۔ بس جاتے ہی وہ وہ ہتھیار استعمال کئے جاتے ہیں کہ ـــ ہری ہری!"

"کیا ہتھیار۔ !تمھیں بھگانے کے لئے۔ !اب تک بڑے انہماک سے وہ اُس کی لن ترانی

سنتا رہا مگر ہتھیا کا نام سنتے ہی وہ چونک پڑا۔ یہی تو چاہیے تھا اُسے۔ اور ابھی ابھی بھوانی ماں سے یہی تو مانگ کر آرہا تھا۔

"تو اجی ___ تم کچھ ہتھیار کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔ بتاؤ نا!"

"دال بھاجی تک تو معاملہ ٹھیک رہتا ہے مگر بریانی، مٹن پلاؤ، مرغ، مچھلی، کباب ___ ان سب سے مجھے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ گھنٹوں میں بے گھری ہو جاتی ہوں۔ یہاں وہاں گھومتی پھرتی ہوں۔ مگر۔ میں کہاں بخشنے والی۔! اس بار بدلہ لے کر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کر لی انھیں وہ مزہ چکھایا کہ وہ بھی کیا یاد کریں گے!!"

بدلہ ___! تم بدلہ کیسے لے سکتی ہو ___!!" بھوک تو اس نے بہت دیکھی تھی مگر ایسی پٹر پٹر کرتی بھوک ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ حیران تھا کہ بھلا بھوک کسی کو مزہ کیا چکھا سکتی ہے۔

"اے واہ ___ نہیں تو کیا تم نے مجھے بے غیرت سمجھ رکھا ہے۔ جب وہ لوگ میری آؤ بھگت نہیں کر سکتے تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ ان کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی۔ اور ___ ایک ہفتے سے نہیں گئی۔"

"۔ تو اس سے انھیں کیا فرق پڑتا ہے۔ اُلٹے ان کی تو عید ہو گئی۔"

"عید ___" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "ذرا جا کر دیکھو کیسے خدا کی ہر نعمت سے محروم ہو گئے ہیں وہ ایک لقمہ کھانے کی حاجت نہیں رہی۔ بے بٹ حالی پڑے ہیں۔ غش پر غش آرہے ہیں ___ حکیموں، ویدوں کی دکانوں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

بھوانی کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ تو ٹھیک کہتی ہے۔ بھی تو سیٹھ ہزاری مل اور سیٹھ بنواری لال کی موٹروں کو اس نے نرسنگ ہوم کے آگے پارک کیا ہوا دیکھا تھا۔

اب بھوانی کو بھوک کی باتیں سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ مگر وہ اتنا میٹھا اور سچا بول رہی تھی کہ بھوانی شنکر نے بلا مقصد ہی اسے بولتا رکھنا ضروری سمجھا، اور بات جاری رکھنے کے لیے نہایت بھدا سوال کر بیٹھا۔

"بوا ___ یہ بتاؤ تمہارا جنم کب ہوا اور اس دنیا میں تمہاری کیا ذمہ داریاں ہیں؟"

"بھوانی۔ تمھیں شاید نہیں معلوم۔ میرا جنم تمہارے جنم سے پہلے ہوا۔ جس طرح مکان بنانے والا پہلے نقشہ بناتا ہے اُسی طرح دنیا بنانے والے نے دنیا بنانے کے تصور کے ساتھ ہی مجھے بنا لیا۔ اور جب انسان کی تخلیق ہوئی تو خدا نے مجھ سے پوچھا کہ بی بھوک! تم انسان کے کس عضو

میں رہا پسند کروں گی تو میں نے اُلٹا خدا سے سوال کیا کہ انسان کے جسم کا سب سے اہم عضو کون سا ہے؟ خدا سے جواب ملا کہ دماغ ایک ایسا عضو ہے جو سارے جسم پر حکومت کرتا ہے۔ تو میں نے انسان کے پیٹ میں رہنے کی اجازت مانگی۔ اُس وقت میری عقلمندی پر خدا کو بھی ہنسی آ گئی تھی۔ اور آج ۔۔؟ تم دیکھ رہے ہو میں دماغ پر بھی حکومت کرتی ہوں۔ جب میں دماغ میں گھس جاتی ہوں تو تم جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔؟"

"نہیں ۔۔" بھوانی خود کو 'بھوک' کے آگے بے زبان محسوس کرنے لگا تھا۔

"دماغ بھوکا ہو جاتا ہے۔" اُس نے کہا۔

"ایں ۔۔ کہیں دماغ کو بھی بھوک لگتی ہے۔" پتا نہیں بھوانی یہ سوال بھوک ہی سے کرنا چاہتا تھا یا اُس کا خود کلامیہ تھا۔ مگر چونکہ بھوک اُس کا سوال سن چکی تھی اس لئے زور زور سے ہنسنے لگی۔

"بھوانی شنکر! تم ٹھہرے ایک سیدھے اور ایماندار مزدور لیڈر۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تمہاری ایمانداری کا قصور ہے۔ تمہیں تو صرف پیٹ کی بھوک کا علم ہے۔ بھوک تو دل کو بھی ہوتی ہے۔ اور بھوک دماغ کی بھی ہوتی ہے۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک مرتبہ ایک کروڑ پتی نے مجھے پیٹ سے نکال کر دماغ میں رکھ لیا، تو وہ برداشت نہ کر سکا اور خودکشی کر لی۔ دراصل وہ ایک غریب آدمی تھا۔ جب میں اُس کے پیٹ میں تھی اُس نے سخت محنت کی اور خوب پیسہ کمایا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ اُسے میری پروا نہ رہی۔ مگر میں ۔۔؟ میں اپنی ذِلّت برداشت نہ کر سکی اور چپکے سے اُس کے دماغ میں جا گھسی۔ پھر کیا تھا جو بھوک اس کے پیٹ کو لگی تھی اب وہ اُس کے دماغ کو لگنے لگی۔ روپیہ کمانے کے لئے اس نے وہ وہ گُر آزمائے کہ اپنے اصولوں سے پھر گیا۔ پھر موت ہی نے اُسے میری چنگل سے آزاد کرایا۔

وہاں سے آزاد ہو کر میں ایک منچلے نوجوان کے دل میں گھس گئی اُس نے بھی میری بے عزتی کی تھی۔ جانتے ہو اس بھوک کا کیا نام ہے۔ اسے ہوس کہتے ہیں۔ بے چارہ عین شباب میں ایک چالیس سالہ خاتون کے عشق میں ایسا گرفتار ہوا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ میں تو چپ سادھے اس کے دل میں بیٹھی رہی، مگر وہ اپنی تباہی برداشت نہ کر سکا، اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اُس کروڑ پتی کا ہوا تھا۔"

"بی بھوک۔ تمہاری کہانی تو بہت طویل ہو چکی ہے۔ کبھی ختم بھی ہو گی ۔۔؟" بھوانی اب بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔

"میری کہانی اُس دن سے بھی پہلے شروع ہوئی تھی جس دن آدم اور حوا کو زمین پہ پھینکا گیا تھا اور اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک کہ سورج سوا نیزے پہ نہ آجائے سچ تو یہ ہے کہ دراصل اس دنیا کی تخلیق کی حقیقی باعث ہی میں ہوں۔ کیونکہ میں نہ ہوتی تو آدم "و زوجہ" کل جنتہ کے معنی سمجھ نہ سکتے۔

بھوانی خاموش کھڑا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اب بھوک نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا کہ وہ بیزار ہونے لگا ہے۔

"کیوں تھک گئے بھوانی ــــ ہمیں مرا آدھا چہرہ دیکھ کر ہی۔ ابھی تک تو تم تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھتے رہے ہو۔ دوسرا نہیں دیکھو گے؟ برخوردار! اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو ہمیشہ میری موجودگی کو محسوس کرتے رہو۔ کیوں کہ دنیا کی ہر ترقی میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے۔ میں نہ ہوتی تو جسم پہ پتے باندھے جنگل جنگل گھومنے والا انسان آج قیمتی پوشاکوں میں ملبوس نظر نہ آتا ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ترقی دنیا کے ساتھ ساتھ انسان اپنی عقل کے مطابق اس میں ردّ و بدل کرتا آ رہا ہے جیسا کہ لباس کہیں جسم کو ڈھانکنے کے لئے استعمال ہو رہا ہے تو کہیں جسم کی نمائش کے لئے۔ یہ اپنے اپنے سوچنے پر منحصر ہے۔ اب یہی دیکھو کچھ لوگ میری مہمان نوازی کے لئے سخت سے سخت محنت کر کے روٹی کماتے ہیں تو کچھ لوگ اپنی جسمانی خوب صورتی کو برقرار رکھنے کے لئے مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ سچ پوچھو تو انسان کی نرالی عقل اور سوچنے کے نت نئے انداز کے ساتھ دوڑتے دوڑتے میں تھک گئی ہوں۔ پہلے انسان اتنا چالباز نہیں تھا تو میرا ٹھکانہ بھی مستقل ہوا کرتا تھا میں نقلِ مقام کرتی بھی تو اس کی وجہ سمجھ میں آجاتی تھی اب تو میں اس دور کے اس پاگل حیوان کے ساتھ دوڑنے دوڑتے تھک گئی ہوں۔ میں عاجز آ گئی ہوں۔ ابھی کچھ دیر قبل جب تم بھوانی ماں سے مجھے مارنے کے لئے ہتھیار مانگ رہے تھے، تو میں نے بھی ماتا کو ہڑتال کی نوٹس دے دی ہے!"

"ہائیں ــــ! ہڑتال کی نوٹس ــــ! تم نے دے دی۔!! یہ تو بڑی اچھی بات ہے!"

بھوانی کا انگ انگ جھوم اٹھا۔ یہی تو وہ چاہتا تھا۔ بھوک سے نجات۔ مارے خوشی کے وہ قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔

"تو ــــ جلدی بتاؤ نا تم کب سے ہڑتال پر جا رہی ہو ــــ؟"

"بکواس بند کرو ــــ تم بڑے بدھو ہو" بھوک کی زبانی اتنی زوردار جھاڑ کھا کر بھوانی کو وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ اپنی اماں کی گود میں بیٹھے بیٹھے ان کے کپڑے گیلے کر دیا کرتا تھا۔

"۔ تم ناراض کیوں ہوتی ہو ماں — یہی تو مجھے چاہئے تھا کتنا اچھا ہوگا جب پیٹ ہی نہ ہوگا۔"
"ہاں ہاں۔ اس ماں کا چکر ختم ضرور ہوگا۔ مگر یہ تو سوچو تمہاری کٹیا کہاں سلامت رہے گی۔"
بھوانی پیٹ اور کٹیا کا سمبندھ سمجھ نہ سکا۔ بونق کی طرح بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے بھوک کی طرف گھورتا رہا۔
"برخوردار! ایک وہ بھی دن ہوگا جب یہ کٹیا ٹوٹ پھوٹ جائے گی، اور اسے مرمت کی ضرورت پڑے گی۔"
"تو کون قیامت ٹوٹے گی۔ پیٹ نہ ہوگا تو سارے پیسے میں اکٹھا کر کے میں اس کٹیا کی جگہ ایک محل کھڑا کر دوں گا۔"

بھوانی کی بات سن کر بھوک بڑی دیر تک ہنستی رہی پھر کہنے لگی، "مجھے انسان کی عقل پہ حیرت ہے۔ اس نے اپنے اطراف دائرے کھینچا ابھی تک ترک نہیں کیا ہے۔ جب تک انسان خود کو قید کرنے کی عادت سے آزاد نہیں ہوگا، وہ مجھ پر تو کیا اپنی خودی پر بھی غالب نہیں آسکتا۔ عزیزم! یہ میں ہی ہوں جو اسے اس کے آپے سے باہر کھینچ لاتی ہوں۔ محنت کرواتی ہوں۔ میں نہ ہوں تو یہ دنیا راکھ کا تودہ بن جائے گی — آگ، آگ نہیں ہوگی — پانی پانی نہیں ہوگا۔ سانپ ڈسیں گے نہیں تو خوف کہاں پناہ لے گا۔ بھوک ہوگی نہیں تو انسان پیٹ بھرنے کے لئے ایندھن کاٹنے کو ڈھونڈے گا۔ تم نے کیپٹلزم کے خلاف مارکسیزم کی تھیوری کو اپنایا ہے۔ مارکس کی تھیوری کو تم کیا خاک سمجھو گے جب کہ تمہیں انسان کی بقا اور ارتقا کا ادراک ہی نہیں ہے۔ مجھ پر قابو پانے کا چکر تمہیں انسان بھی نہیں رہنے دے گا بلکہ تنزل کی طرف پیچھے دھکیل دے گا۔ اور جسم کا یہ رہا سہا لباس نچوا کر تمہارے ہاتھ میں کمنڈل تھما دے گا۔ سمجھے؟"

بھوک کی اسرار و معانی سے پُر تقریر سنتے سنتے بھوانی کا سر چکرانے لگا تھا۔ اُسے طاقت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دوڑتا ہوا کالی مندر پہنچا اور صحن میں رکھے مٹی کے کورے گھڑے سے غٹاغٹ ٹھنڈا پانی پی گیا۔ پیٹ کی جلن مدھم ہوئی تو وہ اندر کی طرف لپکا اور دیوی کے قدموں میں گر پڑا۔ جوں ہی اُس کی آنکھوں سے دھند چھٹنے لگی اس نے سر اٹھا کے دُرگا ماں کی طرف دیکھا۔ دیوی کے قدموں میں پڑا بھبوت اٹھا کر ماتھے پر تلک کیا اور پوری قوت سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ —

۲۱ جنوری ۹۱ء

" ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ [illegible] مزدوروں کی ناسوں سے گونج اٹھا۔

قمر جمالی

...اور پھانسی دے دی گئی

رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ مگر مری آنکھوں میں نیند کا کہیں پتا نہ تھا۔ ورنہ یوں ہوتا کہ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور تکان سے ادھر بستر پر لیٹی کہ اُدھر غائب۔ پھر صبح دم تک مجھے خبر نہ رہتی کہ پلنگ کے عین سرہانے لگی دیوار گیر گھڑی کس طرح جاگ جاگ کر رات کی انتہائی سیاہ اور تنہا گھڑیاں گزارتی ہے۔ بس پہلو بدل بدل کر نیند کو آزماتی رہی مگر نیند بھی شاید مجھے آزمانے کی قسم کھا چکی تھی گزرتے ہر لمحے کے ساتھ مجھ پر خوف و دہشت کا غلبہ بڑھتا رہا، اور میں خواہ مخواہ ہی خوف زدہ ہوتی رہی کیونکہ ہزار کوشش کے باوجود کوئی بات مجھے ایسی یاد نہ آئی جو خوف بن کر یوں میرے ذہن میں محفوظ رہ سکتی تھی۔

گرما کی رات تھی۔ میں نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہی رکھ چھوڑا تھا تاکہ صحن میں چلنے والے خنک ہوا کے جھونکے گاہے گاہے میری خواب گاہ میں آتے رہیں۔ رات کی خاموشی میں نٹ کھٹ بچے کی طرح خوابگاہ کے پردے ہلانے والے رات کی رانی کے جھونکوں سے مجھے ازلی عشق تھا مگر آج ——؟ اُف! آج رات کی تو بات ہی اور تھی مجھے ہر چیز سے ڈر لگ رہا تھا —— ہر گھڑی بھاری لگ رہی تھی —— اور ہوا کے جھونکوں میں بسی رات کی رانی کی خوشبو کسی لاش کے کفن سے اٹھنے والی کافور کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

جانے آج کون مرا ہو گا ——!! پھر میں نے سوچا مجھے اس سے کیا ——! کئی مرے ہوں گے۔ رات کے اسی پہر —— اسی لمحے —— گھڑی کے کانٹے کے اسی قدم کے ساتھ۔

اُف.. کتنی بھیانک ہے اس کی شکل ——! میں نے دیکھا پلنگ کے سرہانے

جہاں گھڑی لگی تھی وہاں ایک خوفناک شکل دکھائی دیتی تھی۔ شاید کسی خوف ناک انسان کی۔ مگر... انسان کی شکل اتنی خوف ناک کہاں ہوتی ہے ـــ!! یا پھر کسی آدم خور حیوان کی ـــ؟ بھینسا سور جیسی ـــ؟؟ ہاں میں نے بھینسا سور دیکھا تو نہیں البتہ بچپن میں نانی اماں کی کہانیوں میں سنا تھا کہ بھینسا سور کی شکل انسان جیسی ہوتی ہے، مگر سر بھینسے کے سر کے برابر ہوتا ہے۔ آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی اور زباں منہ سے باہر لٹکی ہوئی۔

رات کے گزرنے ہر لمحے کے ساتھ تازہ خون کا ایک قطرہ اس کی زبان سے ٹپک کر نیچے جانے کہاں جذب ہو رہا تھا۔ میں نیچے دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔ بس ٹک ٹک اس عفریت کو دیکھتی رہی۔ ایک لمحے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ دل سینے سے نکل کر حلق میں اٹک گیا ہے، اور سانس اُکھڑ اُکھڑ کر چلنے لگی ہے یک لخت میرا ہاتھ میرے شوہر کی بیٹھ کی طرف بڑھا کہ انھیں جگا لوں۔ مگر... اتنی مہلت میں شاید میرے دماغ پر پڑا پردہ سرک گیا تھا کیونکہ اب اُس عفریت کی جگہ مجھے پھر سے وہاں دیوار گیر گھڑی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اپنی کم عقلی پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ دل کو ذرا ڈھارس ہوئی تو خوف جاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ نیند مہربان ہونے لگی ہے۔

ابھی کچھ ہی دیر سوئی ہوں گی۔ کیونکہ میں اپنے لاشعور میں ہوا کے سرسراتے جھونکوں، اور گھڑی کے قدموں کی آہٹ محسوس کر رہی تھی کہ... میں نے دیکھا ـــ پتا نہیں خواب میں دیکھا ہو کہ بیداری میں۔ بہر حال میں نے دیکھا کہ عدالت بھری پڑی ہے۔ جج ایک ملزم کا سر قلم کرنے کا حکم صادر کرتا ہے۔ یکایک ملزم کے لواحقین کی آہ و بکا سے عدالت لرز اٹھتی ہے۔ اُسی عدالت میں کسی کونے میں بیٹھی میں بھی ہچکیاں لے رہی ہوں۔

.... پھر میں نے دیکھا کہ ملزم کو تختۂ دار تک لے جایا گیا۔ ملزم کے بازو ایک نہایت خوف ناک شکل والا، کالا مسٹنڈا جلاد اپنے داہنے ہاتھ میں ایک بڑا سا کتّا¹ لیے کھڑا ہے۔ پھر حکم صادر ہوتا ہے اور... جلاد کا ہاتھ اوپر اٹھتا ہے۔ بس ـــ میں نے اتنا ہی دیکھا، اور چیختے چلاتے بیدار ہوگئی۔ میں نے خوفزدہ

¹ بڑا اور چوڑے پھل والا چھرا۔

آنکھوں سے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا رات کا کوئی ڈھائی بجا ہوگا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ یکایک مجھ پر خوف کا غلبہ ہوا اور میں بے قابو ہو کر چیخنے لگی۔ میری چیخ پکار سے میرے شوہر کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے مجھے کتنا ہی سمجھایا کہ میں نے خواب دیکھا ـــــ مگر مجھے کسی پہلو چین نہ پڑتا تھا۔ میں بار بار یہی کہتی رہی کہ میں نے بیداری میں دیکھا ہے۔ رات کے اس پہر ـــــ اسی لمحے کوئی قتل ہوا ہے میں موجود تھی وہاں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے چلاتی رہی کہ کسی کو شہید کر دیا گیا۔ مگر کس کو ـــــ؟ اس کا جواب نہ میرے پاس تھا اور نہ میرے میاں کے پاس۔

رات دیر گئے تک جاگتے رہنے کی وجہ سے صبح دن چڑھے سوتی رہی، کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اٹھی اور حسب معمول 'دی وائس آف امریکہ' سننے کے لیے ریڈ بجایا تو پہلی نشر ہونے والی خبر ـــــ "پاکستان کے سابق وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو طلوعِ آفتاب سے قبل پھانسی دے دی گئی"۔ سنا تو ایک با پھر میرے ذہن پر پچھلی رات کے خواب کے اثرات واضح ہونے لگے، اور میں اسی طرح چیختے چلاتے بے ہوش ہو گئی

میرے میاں کہتے ہیں مجھے فرسٹ ایڈ کے لیے دوا خانہ لے جایا گیا۔ قریب کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد مجھے ہوش آیا۔ مگر ذہن ابھی خواب کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا تھا۔ آنکھ کھولتی تو مجھے اسی طرح کا احساس ہوتا اور میں سسک سسک کر رونے لگتی۔

"تم نے دیکھا آخر بھٹو کو پھانسی ہو گئی ـــ!" میرے میاں میری اس بچکانہ حرکت پر جھنجھلا گئے۔

"اگر ہو بھی گئی ہے تو کون سا نیا کام ہوا۔ اسیاسی کھیل ایسے ہی خطرناک ہوتے ہیں" وہ مجھے چھوٹی بچی کی طرح سمجھاتے رہے۔

"سیاست مثل اس شمع دان کے ہے جو کسی خوابگاہ میں معلق لٹک رہی ہے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی خوابگاہ کا دایاں بازو روشن رہتا ہے ـــــ تو کبھی بایاں۔ پالیٹکس میں بیوروکریسی کے موقف کو تم ابھی سمجھ نہ سکو گی۔

اس میں تو حریف اپنے سامنے والے کا سر کچل کر فخر محسوس کرتا ہے۔ اور پھر یوں بھی تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ بھٹو کون تمہارا سگا تھا ——؟"

اب میں انھیں کیا بتاتی کہ کسی بھی انسان سے میرا کیا رشتہ ہے —! وہ خود بھی بڑے قابل اور روشن خیال انسان ہیں۔

ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے گھر لوٹنے کی اجازت دے دی۔ مجھے یاد ہے ہماری موٹر عابد سرکل سے گزر رہی تھی۔ ہاں۔ مجھے بس اتنا ہی یاد ہے۔ کیونکہ اس کے بعد دو دن تک میں مسلسل بے سدھ رہی — میرے میاں کہتے ہیں کہ جب ہماری موٹر عابد سرکل سے گزر رہی تھی ایک لڑکا سڑک کے کنارے کھڑا اخبار بیچ رہا تھا۔

"آج کی تازہ خبر —— پاکستان کے سابق وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو آج صبح طلوعِ آفتاب سے قبل پھانسی دے دی گئی" وہ کہتے ہیں کہ میں نے اتنا ہی سنا اور گاڑی سے باہر سر نکال کر چلانے لگی۔

"ہاں ہاں دے دی گئی۔ یہ سچ کہتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ رات کے ڈھائی بجے۔ میں وہاں موجود تھی" اتنا کہہ کر میں پھر سے بے ہوش ہو گئی۔

وہ کہتے ہیں ہماری گاڑی کے اطراف لوگ جمع ہو گئے تھے اور وجہ پوچھ رہے تھے، جنھیں وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی موت کا مجھ پر بُرا اثر پڑا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ لوگ پوچھتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو سے میرا کیا رشتہ ہے —؟

ہاں —— کیا رشتہ تھا —— !! کیا یہ سب نہیں جانتے کہ دنیا کے پہلے انسان حضرت آدم سے ابھی تک ہمارا رشتہ قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔ مجھے لگا دنیا کے سبھی لوگ ایک جیسے ہیں اور اگر۔۔۔ سب ہی ایک جیسے ہیں —— تو میں ہی الگ کیوں — —؟؟!

آج باہوش و حواس مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ایک بلند حوصلہ، باہمت

سیاسی مدبر کو جس کی شخصی یا سیاسی زندگی کے بارے میں مجھے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔ ــــ اور یہ بھی نہیں کہ اُسے موت کی سزا حق بجانب ملی ہے اس سیاسی قیدی کو ۴ راپریل ۱۹۷۹ء کو طلوع آفتاب سے قبل پھانسی دے دی گئی۔ کُلُّ نفسٍ ذائقۃ الموت : ہر نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔ چاہے وہ ذوالفقار علی بھٹو ہی ہو ــــ یا احمد رضا قصوری۔

۴ راپریل ۱۹۷۹ء

قمر جمالی

رات کے دس بجنے میں ابھی تین گھنٹے اور
باقی تھے۔ پھر بھی گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ اُسے
یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا اُس کی زندگی گھڑی کے
لمحہ لمحہ بڑھتے پاؤں سے معلق لٹک گئی ہے چہرے
کا رنگ اُڑا جا رہا تھا اور جسم ہمالہ سے نکلے گلیشئر
(GLACIER) کی طرح پگھل رہا تھا۔

یہ بات نہیں کہ ایسا موقع اُس کی زندگی
میں پہلی مرتبہ آیا ہو۔ مگر اس بار پتا نہیں کیا بات
تھی کہ وہ خود کو بہت نروس محسوس کر رہی تھی۔ ابھی
دو دن قبل اُسے اس شہر میں منتقل کیا گیا تھا۔
بتاتے ہوئے کہ آپریشن ۱۲ مئی رات دس بجے
کا ہے۔ اُس وقت وہ اِس شہر کے سب سے
زیادہ فیشن ایبل علاقے کی نہایت خوب صورت
چار منزلہ عمارت کی چوتھی منزل کی بالکنی سے
باہر جھانک رہی تھی۔ یکایک اس کے گلے کی
لاکٹ میں پیوست ٹرانسمیٹر پر اُسے سگنل ملا۔
حسب ہدایت لاسلکی فون پر ہدایت وصول کرنے
وہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا گگن
پہلے ہی سے ایک صوفے پر نیم دراز تھا۔

"تت۔۔ تم ۔۔۔ یہاں ۔۔۔؟ ابھی ابھی
تو مجھے تمہارا سگنل ملا۔۔۔!"

ہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اب تو تم سمجھ گئی
ہو نا کہ گگن کو کہیں پہنچنے کے لئے میڈیا
(MEDIA) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ہواؤں
میں سفر کرتا ہے ۔۔۔ فضاؤں میں کبھی جسم

ہے ــــ اور کبھی جسم کے بغیر۔ واگھرن موت کا دوسرا نام ہے۔ جہاں وہ ہوتا ہے ــــ وہاں زندگی تانڈو ناچتی ہے ــــ موت کا ناچ۔ سمجھیں!"

"میں ــــ میں!" لوکھلاہٹ میں بھول گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

ہاں؟ ــــ میں بھی دیکھ رہا ہوں تمہارے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا ہے۔ ہاتھ کانپنے لگے ہیں اور کانپتے ہاتھوں سے تاریخ نہیں لکھی جاتی۔ میں تمہیں چیتاونی دینے آیا ہوں۔ " L \ , K ... "

"CF WHAT ... آموکٹی تھوک نگل کر بڑی مشکل سے اپنا مفہوم ادا کر سکی۔
OF WAGHREN کیونکہ واگھرن کے قدم کبھی پیچھے نہیں لوٹتے ــــ اور آج واگھرن کے پاؤں سے تمہارا نام بندھ گیا ہے سمجھیں؟"

"دھمکی دیتے ہو ــــ؟

"دھمکی ــــ؟ اور نہیں ــــ!!" پھر بڑی دبنگ وہ تحقیر آمیز قہقہے لگاتا رہا۔ آموکٹی کو لگا جیسے واگھرن کا ہر قہقہہ اس کی نس نس سے بندھی برقی رو کو چھو رہا ہے۔ اس کے بدن میں برقی رو دوڑنے لگی۔ خون کی گردش کے تیز ہوتے ہی دھماں پاں سی آموکٹی کے جسم میں شرارے پھوٹنے لگے۔

"بند کرو یہ قہقہے۔ تم جانتے ہو میں ایسی تحقیر برداشت نہیں کر سکتی۔ ٹارگٹ بتاؤ اور دفان ہو جاؤ۔"

"7 A 4"

"ستاحب ــــ؟"

"آدھا گھنٹے قبل۔"

"کہاں ملے گا ــــ؟"

"شہر سے (۴۰) چالیس کلو میٹر دور ہائی وائکس (... K ...) پر وہ ایک بہت بڑی میٹنگ سے خطاب کرنے والا ہے!"

"ذریعہ ــــ؟"

"تمہاری اپنی کار۔"

---

*۱۔ خبردار رہو۔ * ۲۔ واگھرن سے

"نمبر —— ؟"

"TTA H96"

"ڈرائیور —— ؟"

"سیلف ..."

"ہتھیار —— ؟"

"تم خود۔"

"سمجھی نہیں۔"

"یہ تمہارا آخری آپریشن ہوگا۔"

"کیا —— ؟" دہشت سے اموکٹی کی جان نکلتے نکلتے اٹک گئی۔

"تنظیم کا مقصد کئی ہزار زندگیوں سے زیادہ اہم ہے۔"

"پھر بھی —— ؟"

"تمہارا نام لسٹ لسٹیڈ ہے۔"

"اب میری ضرورت باقی نہیں رہی۔"

"تمہاری زندگی اب تنظیم کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ انشورنس کامیاب ہوجائے گا۔" اموکٹی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"واگھرن کو تمہارے انشورنس کی ضرورت نہیں۔" پھر اس نے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھاکر کامیابی کا سگنل دیا اور برق رفتاری سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

واگھرن کو رخصت ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی، مالکی سے وصار میں دور تک اپنے جسم کے چیتھڑے اڑتے دیکھتی رہی۔

کبھی گمنام مرے گی۔ یہ شمشان میں اس کی چتا جلے گی اور نہ آتما کی شانتی کے لئے اس کی استھیاں گنگا کے سپرد کی جائیں گی۔ اپنی زندگی کا ایسا انت اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اماں تو کہتی تھی کہ اس نے اپنا سوامی کے حضور ماتھا ٹیک ٹیک کر فریاد کی تھی کہ اس کی اکلوتی بیٹی کو سہاگن رکھنا۔ مرنے کے بعد بھی دلہن کی طرح سجی سنوری بی کے آگ سے وداع کرنا۔

---

* اسود * استھی

مگر۔۔ وہ سب پلک جھپکتے میں کہاں کھو گیا ـــ! اماں کیسے صبح سے شام تک پوجا پاٹ کرتی اور اپنی چھوٹی
سی گرہستی کو بنائے رکھنے کی کوشش کرتی۔ ۔ *۔ شاید وہ ساری عبادتیں اور دعائیں اماں کے اپنے حق میں
قبول ہو گئیں۔ سچ مچ ایک دن اچانک ہی اماں، ابا کا آنگن چھوڑ، دلہن کی طرح سجی سنوری اگنی پرویش
کر گئی۔ اس دن چتا کے قریب کھڑی بارہ، چودہ سالہ اموکٹی نٹ نئی اماں کو ڈھونڈتی رہی۔ مگر پتا ہی نہ
چلا کہ اگنی اماں کو بھسم کر گئی ـــ یا اماں خود اگنی نگل گئی۔

اماں کے جانے کے بعد ابا پر دیش پریم کا بھوت کچھ اتنا زیادہ سوار ہوا کہ اموکٹی کو وہ پاگل
لگنے لگا۔ ابا کئی کئی رات گھر سے غائب رہتا ـــ یا آتا بھی تو اموکٹی کو اسے دیکھ کر خوف محسوس ہوتا۔
بڑھے ہوئے بال، ابلی ہوئی لال لال آنکھیں، چہرے پر وحشت اور درندگی۔ کبھی ہمت کر کے وہ جاننا بھی
چاہتی تو ابا یا تو کوئی گول مول سا جواب دے دیتا، یا پھر ایسی خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتا
کہ اموکٹی کو لگتا کہ جیسے ہی وہ میرا اتا کار رہا ہو ـــ مگر اتنا ضرور بدل گئی ہے۔

کبھی کبھی ابا کے ساتھ واگھرن بھی گھر آتا اور جب واگھرن ساتھ ہوتا تو، ابا اندر سے اپنے
کمرے کا دروازہ بند کر لیتا اور پتا ہی نہ چلتا کہ واگھرن اپنے گھر کب لوٹتا۔ صبح اموکٹی کو ابا کا کمرہ کھلا
ملتا اور اس میں فرش پر دیسی شراب کی بوتلیں، ٹوٹی بوتل کے ٹکڑے ـــ اور ادھ جلے سگریٹ
کے بے حساب ٹکڑے سمٹے پڑے۔ کتنی نفرت ہونے لگی تھی اسے ابا سے ـــ اور ابا بھی کتنا بدل
گیا تھا۔ اموکٹی کو لگا کہ اب ابا کو واپس راستے پر لانا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ اب
ابا انسان سے درندہ بن گیا تھا۔ سو منسز سنگرام کا وہ راستہ پتا نہیں کہاں اس کے پاؤں سے
چھوٹ گیا اور اب تو وہ اسے کٹھور جانتر وادی، آتنک وادی ـــ اور دیش دروہی لگنے لگا تھا۔

اس رات وہ دیر سے گھر لوٹی تو دور ہی سے اپنے گھر کی جلتی بتی دیکھ کر اسے ایک گونا اطمینان
سا ہوا۔ اس کے اندر ایک بے چین سا احساس بیدار ہوا۔ اس نے سوچا کہ کیا ہی اچھا ہو کہ آج اسے
اس کا کھویا ہوا باپ مل جائے۔ اتنی اکیلی ہو گئی ہے وہ! اب کی بار وہ اسے جانے نہ دے گی۔ اس کے پیروں سے
لپٹ جائے گی ـــ اس کی گردن سے جھول جائے گی اور ہزاروں بوسے لے کر اسے منالے گی اور پوچھے گی کہ
جو درندہ رو کر بھی وہ ابھی اطلوی بیٹی کو ناتھ سمجھنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ وہ اسے سمجھائے گی "ابا جس راستے پر
تو چل رہا ہے، وہ راستہ نہ تجھے زندگی سے ملائے گا اور نہ ہی اس راستے میں کسی دوسرے انسان سے تیرا سابقہ پڑے گا"
وہ پوچھے گی

---

* ا جسم

کہ کیا اس کی تنظیم انسانی حقوق کی بحالی کے لئے سرگرداں نہیں ہے ؟ اور اگر ہے تو وہ انسانوں سے منحرف کیوں ہے ؟ کیوں کہ جہاں حقوق پنپتے ہیں وہاں انسانیت زندہ رہتی ہے۔ اور انسانیت زندہ انسانوں کے اطراف کھنچی روشنی کی لکیر کا نام ہے۔ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہ انسانیت کو زندہ کیسے رکھ سکے گا۔ جن کے حقوق کی بحالی کے لئے وہ خود کو سنگرامی گردانتا ہے۔ انھیں کی زندگیوں سے کیوں کھیلنے لگا ہے۔!

ان ہی خیالات میں غرق جب وہ اپنے گھر کے اندر داخل ہوئی تو ہمیشہ کی طرح سارے گھر میں اندھیرا پڑا تھا۔ ہاں مگر آپا کے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور دروازے کی جھری سے روشنی کی لکیر باہر آنگن کو چیرتی ہوئی کہیں دور گم ہو گئی تھی۔

آپا کا حکم تھا کہ جب تک وہ خود باہر نہ آجائے اُسے آواز نہ دی جائے۔ آج کل تو اموکٹی کی حالت اس خوف زدہ ہرنی کی سی تھی جو چیتے کے مسکن کے آس پاس ہی کہیں رہتی ہو۔ پھر آپا کے احکام کی خلاف ورزی اس کے بس کی بات نہ تھی۔

مگر... آج رہ رہ کے اس کے اندر کوئی جاگ رہا تھا۔ اُس کے اپنے اندر ایک انقلاب آرہا تھا۔ اُس کا انگ انگ یوں ٹوٹ رہا تھا جیسے ہر عضو اپنی جگہ ایک مکمل جان رہا ہو۔ اُس کے جسم کے کل سے آزاد ہو رہا ہو۔

اُموکٹی پہلے تو اس تشنجی کیفیت کو اسے فرسٹریشن[1*] (FRUST RATION) کا نتیجہ سمجھتی رہی۔ مگر جب حالت قابو سے باہر ہو گئی تو اس سے رہا نہ گیا اور وہ دبے پاؤں آپا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک طرف سمیٹا اور دروازے کی جھری سے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ یکایک اسے لگا جیسے ایک تیز دھاری برچھی کی انی اُس کے دل میں چبھ کر ٹوٹ گئی ہے۔ پسینے سے اُس کا جسم تربتر ہو گیا اور سانس دھونکنی کی طرح بے قابو ہو گئی ہزار ضبط کے باوجود اس نے محسوس کیا کہ بغاوت کو دبانا اب اُس کے بس سے باہر ہو گیا ہے۔ کان، آنکھ اور ناک سے انگاروں کے لپکے نکلنے لگے۔ اس نے ایک بار اپنے آپ کو ٹٹول کے دیکھا کہ کہیں دیو مالائی کہانیوں کی طرح اُس نے کوئی اور روپ تو دھارن نہیں کر لیا ؟ مگر... ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ انسان ہی تھی بالکل ویسی ہی پھر... اُس کے جسم سے یہ آگنی ورشا کیسی!!

۱*۔ احساسِ ناامیدی۔

اُس کا اپنا اَپا جسے وہ دیوتا تو سمجھتی تھی، پھر بھی درندوں سے بھی گیا گزرا ہوگا۔ یہ ملت اُس کے تصور سے بعید تھی۔ وہ الٹے قدموں دوڑتی ہوئی اندر گئی اور ناریل چھیلنے والا تیز دھاری کتہ لئے اس زور سے دروازے پر حملہ آور ہوئی کہ دروازہ پتا نہیں اندر سے بند تھا بھی ــــ یا پھر بھگوان کی مرضی بھی یہی تھی کہ ایک ہی دھکے سے کھل گیا۔ پھر اس نے پوری قوت سے اَپا کے سر پر وار کردیا جیسے وہ اپا کا سر نہ ہوا، درخت سے لٹکا ہوا کچا ناریل ہوا۔ مگر ــــ گردن کے سر سے جدا ہوتے ہی خون کا فوارہ اُبلتا دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی کہ اَپا تو انسان ہی تھا ــــ اس کے جسم میں خون تھا، وہی خون جو خود اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے ــــ اور وہی خون جو اَپا کو اس کے اپنے اَپا سے ورثے میں ملا تھا جو اپنے وقت کا بہت بڑا سوتنتر سنگرامی تھا۔ پھر ــــ جو اس کی نظر اس عورت پر پڑی، تو اسے لگا۔ جیسے دیوانگی اس سے بس ایک ہی قدم پر کھڑی ہے۔ کیوں کہ جس کی عزت بچانے کے لئے اس نے اپنے باپ کا خون کیا تھا، وہ بے حد اطمینان سے یوں اکڑی کھڑی ہو گئی جیسے اس کی عزت نہیں لوٹی جا رہی تھی، بلکہ کوئی مقدس کام ہو رہا تھا ۔ مارے شرم کے اَموکٹی نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔

"تم نے غلط سمجھا بہن ــــ یہ لوگ دراصل میرے جسم کے اُن علاقوں پر اپنے پیغام اینکوڈ ([illegible]) کر رہے تھے جہاں جھانکنے کی ہمت سرکاری حکام بھی نہیں کر سکتے"

"تمہیں شرم نہ آئی۔ تم نے تو ساری ناری ذات کے کپڑے نچوا دیئے۔ تھو۔ کتنی گندی ہو تم۔ اور یہ تمہارا شریر"

"نہیں بہن ۔! آج تم جسے بے عزتی سمجھ رہی ہو، کل وہی ساری قوم کا سر اُونچا کرنے کی ذمہ دار بنے گی۔ میں بے عزت کہاں ہوئی ہوں ۔! کیونکہ میں تو بس ایک شریر ہوں ۔ آتما تو میں نے کبھی کی تنظیم کے نام کر دی۔ اب تم ہی سمجھو آتما کے بغیر شریر کی شناخت ہی کیا ۔! تم اس شریر کے گندہ ہونے کی بات کرتی ہو، اس ایک شریر کی بات ہی کیا ــــ اگر مجھے ایسے ہزار شریر ملیں تو میں وہ سارے کے سارے اِس تنظیم کے نام کر دوں گی"

غم و وحشت سے نڈھال اَموکٹی کو اِس عورت کی باتیں دور کسی غار سے آنے والی آواز معلوم ہوئی۔ اسے اپنا جسم گوشت پوست کا نہیں مٹی کا تودہ معلوم ہوا۔ جو لمحہ لمحہ ریزہ ریزہ ڈھیئے رہا ہو۔ دوبارہ جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ ــــ کسی اور جگہ تھی واگھرن کے مضبوط حصار میں شاید اب اُس کی آتما بھی تحلیل ہو گئی تھی ــــ اور باقی رہ گیا تھا

* خفیہ تحریر میں لکھنا۔

سٹر یم ۔
گھڑی کے گھنٹے کے ساتھ ہی وہ چونک اٹھی ۔ دس بجنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا ۔ اسے احساس ہوا کہ اِس وقت تو اُسے واگھرن کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا، جہاں اس کا حلیہ تبدیل ہونا تھا ۔ بڑی تیزی سے وہ اپنے فلیٹ سے نکلی اور ٹیکسی کے ذریعہ جائے مقصود پہنچ گئی ۔ حلیہ تبدیل کرنے کے بعد واگھرن اُس کے ساتھ لفٹ تک اُسے چھوڑنے آیا ۔ یہ شاید اُس کا اپنا طریقہ تھا بڑھاوا دینے کا یا پھر، اس کی کوئی چال ۔
اب صرف آدھا گھنٹہ ـــــ اور پھر . . . ۔ آپریشن 789 ۔" واگھرن نے داہنے ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر اموکٹی کو آگے بڑھنے کا اشارہ دے دیا ۔
لفٹ سے نکل کر وہ تقریباً دوڑتی ہوئی کار تک پہنچی، اور حسب ہدایت ٹارگٹ کی شناخت کے لیے جوں ہی اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی گدّی اٹھائی، اُسے لگا جیسے دل کے اندر کوئی شریان تڑپ کر پھٹ گئی ہو ۔ اُسے محسوس ہوا اندھیرے کا ایک پہاڑ بڑی تیزی سے اُمڈتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ گھبرا کر اس نے جلدی سے سیٹ گرادی اور خود بھی دھڑام سے سیٹ پر دراز ہو گئی ۔
"او ـــــ واگھرن ـــــ واگھرن ـــــ تو شیطان بن گیا ہے"
ندی کی باڑھ کی طرح چڑھتے غصے کو اتنے کم وقت میں قابو میں کرنا اس کے لئے بڑا مشکل تھا ۔ اس نے جلدی جلدی موٹر کے شیشے چڑھائے اور واگھرن سے بات کرنے کے لئے خفیہ ٹرانسمیٹر کا سوئچ آن کیا ہی تھا کہ کال ریسیونگ سگنل بجنے لگا ۔ اُس نے جلدی سے ٹرانسمیٹر کا ریسیور اپنے کان سے لگا لیا ۔
"کار کی پچھلی سیٹ پر ایک بکے (*[2] BOUQUE) رکھا ہے ۔ تمہارا کام اس بکے کو ٹارگٹ کے ہاتھ میں تھما دینا ہے ۔ اوور اینڈ آل ـــــ رابطہ کاٹ دیا گیا ـــــ اوور اینڈ آل " پھر کھٹ کھٹاک کی آواز کے ساتھ ہی ٹرانسمیٹر خاموش ہو گیا ۔
"یو ـــــ باسٹرڈ ـــــ سن آف اے سوائن (*[2] SON OF A SWINE)"
پاگلوں کی طرح وہ خود ہی اپنے بال نوچتی رہی ۔

---

۱ گلدستہ ۲ سوٴر کا بچہ

"تم ـــــ تم درندہ بن گئے ہو۔ اپنے اصولوں سے پھر گئے ہو۔ اس شخص کو ختم کر دینا چاہتے ہو جو کبھی بھی تمہارا دشمن نہیں رہا[1] جس کی ساری نسل اس دیش کی خدمت کرتی رہی ـــــ جس کی ماں نے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی دھرتی کے پیاسے ہونٹوں میں ٹپکا دیا تاکہ یہ دھرتی تتر بتر ہو کر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے۔ پھر بھی تم ـــــ او ـــ واگھرن تم شیطان بن گئے ہو ـــــ اور میں شیطان کی پیروی نہیں کر سکتی۔"

پسینے سے سر اور چہرہ پونچھنے کے لیے جوں ہی اس نے جیکٹ کے اوپری جیب میں ہاتھ ڈالا جیب کے نیچے ٹِک ٹِک کرتی آواز کو محسوس کر کے اُسے یقین ہو گیا کہ زندگی کی گاڑی سیٹی دے چکی۔ ابھی آدھا گھنٹہ قبل جب اس کا حلیہ تبدیل کرنے کے لئے اسے بے ہوش کیا گیا تو اُن شیطانوں نے اس کے جسم کے اندرونی حصے پر بم باندھ دیا تھا۔

واگھرن کے خلاف اپنے دل میں اٹھتے طوفان پر قابو پانا مشکل تو تھا، مگر امو کی جیسی بلند حوصلہ لڑکی کے لئے نا ممکن ہرگز نہیں۔ اگرچہ کہ اس کی کنپٹی کی رگیں بری طرح تن رہی تھیں، اور وہ خود کو اتنی بے بس محسوس کر رہی تھی جیسے بلّی کے پنجے میں دبی چوہیا۔ پھر بھی حوصلے بلند ہوں تو کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا ـــــ اماں تو بہر کیف دیسی ہی تھی۔

اسٹیرنگ وہیل پر سر رکھے، آنکھیں بند کئے بڑی دیر تک وہ اپنے اندر ہوتی جنگ کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ دوبارہ جب اس نے سر اٹھایا تو آنکھوں سے مایوسی کی دھند چھٹ چکی تھی۔ آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ساحل کی طرف سے آتی خنک ہواؤں سے اُسے تازگی کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر ـــــ ایک عزم کے ساتھ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور لمحہ بھر میں اس کی گاڑی امو ہی کی لاش کو روندتی ہوئی گزر گئی۔

وقتِ مقررہ سے کچھ منٹ قبل ہی وہ ہائی راکس (HIGH ROCKS) پہنچ گئی۔ آس پاس نظریں گھما کر اُس نے واگھرن کو تلاش کیا جو اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ پھر اُس نے سوچا کہ اُس بہروپیے کا کیا بھروسہ ـــــ!

حوصلے کی پختگی سے اُس کی چال میں اعتماد آ گیا تھا۔ اُسے خود کو جرنلسٹ گیلری (JOURNALIST GALLARY) میں شامل کرتے ہوئے کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ اسے تعجب تو اس بات پر ہوا کہ کسی نے اُس

---

[1] ۔ حلقہ

کاسٹ ناخنی کارڈ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ پروگرام کے مطابق ایک کار پنڈال سے ذرا فاصلے پر آ رکی۔ V I P لاونج کے لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ لوگ جوش و خروش سے ہاتھ ہلاتے ہوئے زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ کار کا دروازہ کھلا اور ٹارگٹ دونوں ہاتھ جوڑے نمودار ہوا۔ کتنا مقدس لگ رہا تھا وہ اس وقت! سفید کرتا پاجامہ اور گلے کے اطراف لپٹا کھادی کا زرین کور والا کھنڈوا، متناسب قامت، ستوان ناک، سرخ و سپید رنگت، چالیس پینتالیس کا سن۔۔ اور ہونٹوں پر مشفقانہ مسکراہٹ۔ جوں جوں ٹارگٹ پنڈال کے قریب بڑھ رہا تھا اموکتی کو لگا کہ اس کا دل سینہ پھاڑ کر باہر نکل پڑے گا۔

پنڈال کے قریب پہنچ کر ٹارگٹ نے وی۔ آئی۔ پی لاونج کی طرف رخ کئے نمسکار کیا۔ پھر جیسے ہی ٹارگٹ کا رخ جرنلسٹ گیلری کی طرف ہوا، اموکتی نے الٹی گنتی گننا شروع کر دی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ بس دس قدم۔۔۔ دس قدم رہ گئے تھے۔ ان دس قدموں کے بیچ اسے ایک تاریخ لکھنی تھی۔ عورت کی مہانتا کی تاریخ، جو اس سے اس کے کرتوبہ کا پالن چاہتی تھی۔ عورت جو ماں بھی ہے بیوی بھی۔۔۔ دیوی بھی ہے فقط ناری بھی۔ لکشمی بھی ہے اور درگا بھی۔ سنیاسی بھی ہے رانی جھانسی بھی۔ سب سے اتم بات تو یہ کہ دنیا کا ہر مرد اسی کا جنما ہوا۔۔۔ پھر۔۔۔ جسے جنما اسے خود ہی کیا مٹانا۔۔۔!

دس۔۔۔ نو۔۔۔ آٹھ" اموکتی کے اندر بڑی تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی۔

"سات۔۔۔ چھ" اس نے محسوس کیا کہ اس کی شخصیت تحلیل ہونے لگی ہے۔ پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ شریر سے سانسوں کا سمبندھ چاہے جیسے چھوٹے آتما تو بس ایک ہی ہے۔ اگلی پرویش۔ اس نے اپنی گنتی جاری رکھی۔

"پانچ۔۔۔ چار۔۔۔ تین۔۔۔ دو"

پلک جھپکتے میں وہ دوڑتی ہوئی ٹارگٹ کے اطراف ہالہ کئے پولس افسروں کے درمیان پہنچی اور ان میں سے ایک کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف پلٹایا۔

"میں اموکتی۔۔۔ بلیک پینتھر واگھرن۔۔۔ مستری ہو دے ٹارگٹ ہر۔۔"

آخری گنتی۔۔۔" ایک۔۔۔" اس نے حلق پھاڑ کر کہا اور بجلی کے جھماکے کی طرح انسانوں کے نرغے سے باہر ہو گئی۔۔۔ ہجوم سے دور ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شریر کا اگلی پرویش۔

۲۰ ستمبر ۱۹۹۱ء

قمر جمالی

"جانور"
ایک بار پھر اپیا کے منہ سے نکل گیا جانے کتنی
بار وہ اب تک اس اسمِ غیر معروف کی تکرار کر چکی تھیں!
ہر بار اماں بی بڑی امید سے سرِ راہ انتظار اپنی
آرزوؤں کا چراغ جلا دیتیں جو صبح کاذب تک
جھک جھک کر جلتا، اور صادق سے پہلے خود اپیا
ہی اُسے پھونک مار کر بجھا دتیں۔ پھر کسی
عمر رسیدہ خاتون کی طرح اماں بی کو دلاسا دیتیں
"اماں بی! وہ ضرور آئے گا جس کی میں امانت
ہوں۔ یوں ایک کی امانت دوسرے کے سپرد
نہیں کی جاتی۔ اور تم تو جانتی ہو دونوں کا ملنا
خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ پھر خدا کے دربار میں
ناانصافی، حماقت اور بدنامی کا دخل کہاں ——!
اپیا کی تسلی سے اماں بی کی ہمت بندھ جاتی اور ان
کی دھندلائی ہوئی آنکھیں ایک بار پھر چمک اٹھتیں۔
شاید اپیا کی شادی کی آرزو اور حد سے بندھی امید
ہی اماں بی کی آنکھوں میں سمائی سن کر سما گئی تھی
ورنہ ٹوٹے کے تک سک ہو کر بھی اُن کے قویٰ برابر
تھے۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اماں بی نے کسی
کا تذکرہ چھیڑا کہ اپیا کا پارہ چڑھ گیا۔ مگر اپیا
کی ہمت اور ... باتوں سے اُن کی ٹوٹتی ہوئی امید
ایک بار پھر بندھ گئی، ناتواں لب مسکرا اٹھے،
اور ... سے تھر تھراتے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔
"پروردگار ——! میری بیٹی کے سہرے کے پھول

جلد کھلا دے "

اپیا اپنے کمرے میں جاتی ہوئی اماں بی کی خدا سے پُر خلوص دعائیں کر مسکرا دیں مگر دوسرے ہی لمحے زمانے کی سچائی ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی اور ہونٹ غصے سے بھنچ گئے ۔

"پودا تم نے لگایا ہی کب تھا اماں بی کہ پھول کھلنے ۔۔۔! اپیا کا طنز بھرا فقرہ سنتے ہی اماں بی چونک پڑیں ۔ دعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھ بیچ کر پڑے اور وہ سوالیہ نظروں سے اپیا کی طرف دیکھنے لگیں ۔ وہ ایک جہاں دیدہ عورت تھیں ۔ وقت کے ماتھے کی لکیریں پڑھ لیتیں تو کیا اپیا کی مسکراہٹ میں پنہاں درد کو محسوس نہ کرتیں! گھڑی دو گھڑی قبل جو چمک ان کی آنکھوں میں نمودار ہوئی تھی وہ یکایک ماند پڑ گئی ۔ بجھتے دیئے کی لو کو تھرتھراتا دیکھ کر اپیا تلملا اٹھیں اور الٹے پاؤں آکر اماں بی کے تخت پر بیٹھ گئیں ۔

"بعض سچائیاں ایسی ہوتی ہیں اماں بی کہ انھیں مصلحتوں پر قرباں نہیں کیا جا سکتا ۔ پھول تو اب اس گلشن میں کھل نہیں سکتے ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلا ہوا پھول اٹھا کر میں ہی اپنے جوڑے میں اڑس لوں ۔ مگر میں ایسا کروں گی نہیں ۔ سچائی تو بس سچائی ہے چاہے کسی کڑوی ہی کیوں نہ ہو"

اپیا نے اپنی ساڑی کے پلو سے اماں بی کے آنسو پوچھے اور سروتے سے چھالیہ کتر کر اپنے منھ میں ڈال لی ۔ پھر اس کی کشتی اماں بی کے قریب کرتے ہوئے بڑی بوڑھیوں کی طرح بہلانے لگیں ۔ " لو پان کھا لو ۔ کب سے بیٹھی ہوئی ہو؟ آرام سے لیٹی رہو نا ۔ پان کھاؤ نا ۔ لاؤ میں بنا دوں"

اپیا کی شفقت بھری باتیں سن کر اماں بی کا دل بے قابو ہو گیا اور دامنِ ضبط ہاتھ سے چھوٹ گیا ۔

"رو نہیں اماں بی! چپ ہو جاؤ ۔ نہیں تو تمہارے آنسوؤں میں بہہ کر میں کہیں گم ہو جاؤں گی"

پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس پڑیں ۔

یہ کوئی نیا تماشہ نہ تھا ۔ تقریباً ہر دن ایسا ہوتا تھا ۔ کبھی اپیا ، اماں بی کو پکارتیں ، اور کبھی اماں بی اپیا کو ۔ اور کبھی اپیا پیچ و تاب کھاتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس جاتیں تو رات بھر جانے کن کن روحوں سے ہم کلام رہتیں کہ صبح اُٹھتیں تو ان کی آنکھیں سرخ اور چہرہ متورم ہوتا ۔ اپیا کا کمرہ کیا تھا کتابوں کا قبرستان تھا ۔ کبھی کبھی اماں بی اکیلی بیٹھی بیٹھی اکتا جاتیں اور گرتی پڑتی دیوار کا سہارا لے کر اپیا کے کمرے میں گھس جاتیں تو بس کہرام مچ جاتا ۔ اپنی کمزور اور لاغر آواز میں مقدور بھر چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیتیں ۔

"اس قبرستان میں بس کر تو بھی ایک لاش بن گئی ہے ۔ ٹھہر کل جب تو عدالت ہو دے گی

میں ان قبروں میں آگ لگا دوں گی "
"نہیں نہیں اماں بی! خدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔ ایک ایک قبر کو بخنہ کرنے میں میں نے اپنی ساری تو انائی
اور کمائی خرچ کی ہے۔ کوئی بھی کتاب چار پانچ سو سے کم نہیں ہے "
چار پانچ سو۔۔! اپنے بوپلے منہ سے اماں بی اپیا کو چڑانیں تو ترمانے کی ساری سختی بھول
کر اپیا جھوم جھوم کر ہنسنے لگتیں، پھر ان کی کمر میں باہیں ڈالے ان سے لپٹ جاتیں۔
"میرا یہ قبرستان، جنت البقیع کی طرح مقدس ہے۔ یہاں تو زور سے بات کرنا بھی منع ہے۔ اگر
میں یہ کتابیں نہ پڑھوں، تو دوسروں کو مصیبت سے نجات کیسے دلواؤں گی آپ کو تو فخر ہونا
چاہئیے کہ آپ کی نواسی۔ ۔ ۔ ۔"
"وکیل ہے وکیل" اماں بی تلملا اٹھیں۔ "ارے بھاڑ میں جائے ایسی وکالت۔ جانے کون کئے کی
سزا بھگت رہی ہوں تجھے وکالت پڑھا کر۔ میں تو چاہتی ہوں تیری گرہستی ہو۔ ننھے منے بچے ہوں
جنھیں میں گود دوں کھلاؤں۔ وہ مجھے تنگ کریں میری جان کھائیں "
"یہی تو میں نہیں چاہتی۔ کتنا دکھ ہوگا مجھے جب وہ آپ کو تنگ کریں گے "
"دکھ کی بچی ــــ" سامنے پڑی ایک کتاب اٹھا کر وہ اپیا پر مارنے دوڑتیں، مگر کتاب اُن
سے اٹھتی کہاں تھی ــــ! پھر اپیا بھی ڈر جاتیں کہ جلد نہ اکھڑ جائے دوڑ کر کتاب ہاتھ سے
لے لیتیں اور انھیں بہلاتیں۔
"اُفوہ ــــ! اتنا جلال ــــ اور ــــ! کون کہتا ہے شادی نہیں کرتی ہے۔ ارے اماں بی!
شادی کئے بغیر یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کٹے گی۔ مگر۔ ۔ ۔ "
"مگر کیا ــــ؟" اماں بی خوف زدہ ہو جاتیں کہ صراطِ مستقیم پر چلتے چلتے اپیا کی گاڑی پھسل
نہ گئی ہو۔
اپیا، اماں بی کی آنکھوں میں خدشوں کے سایے ابھرتے دیکھتیں تو ہتھیار ڈال
دیتیں۔ مگر۔ ۔ آج ہمیشہ کی طرح اپیا کو نرم پڑتا ہوا دیکھ کر اماں بی جلدی جلدی
تسبیح گھمانے کے بجائے اُلٹے ان کے سر ہو گئیں۔
"تو کہہ دوں اُس سے ــــ؟" بجھی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ لئے وہ سراپا سوال بن
گئیں۔
"آپ کا مطلب اُس منظور ے والے سے ہے ــــ؟"

"ہاں ہاں اُسی سے ہے۔ ارے بات بڑی روٹی کون بھوکا ٹھکرائے۔ میں پوچھتی ہوں اس زمانے میں شریف لڑکے ملتے کہاں ہیں ۔ لڑکا اچھا ہے صحت مند، خوبرو خوش پوشش اور کمائی پوت۔ کیا ہوا اگر وہ تیری طرح سرکار کی چاکری نہیں کرتا۔ بڑے پلے کا بیوپاری ہے۔ پھر مسلمانوں کے لئے بیوپار کرنا سُنت کی پیروی کرنا ہے مجھے تو یہی پیشہ پسند ہے نہ کہ تیری موئی عدالت جہاں جکنی جپڑی جھوٹ سے سچ کا منھ کالا کیا جاتا ہے۔"

ہمیشہ کی طرح آج بھی ذکریا رومی کا نام سن کر اپیا کا خون کھول گیا۔ ہزار ضبط کے باوجود لفظ جانور، ان کے منھ سے نکل ہی گیا۔

"حد ادب میں رہنے کی کوشش کرو لڑکی۔ خدا سے ڈر" وہ بھول گئیں کہ اماں بی بالکل ان کے قریب کھڑی ہیں اور کتابیں اب بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔

"لو میں نے توبہ کی اماں بی۔ اب جاؤ۔ پلیز۔ مجھے تنہا چھوڑ دو"

ذکریا رومی کا نام ہی ایسا تھا جسے سن کر اپیا آپے سے باہر ہو جاتیں۔ کبھی ان کی زندگی سے جڑا ہوا تھا یہ نام۔ مگر اب نفرت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ وہ اس نام کو بھی اپنی زبان سے ادا نہیں کر سکتی تھیں۔ محبت پر سے اُن کا ایمان اٹھ گیا تھا۔ نفرت کی یہ دیمک ان کی زندگی میں زہر ہلاہل گھول چکی تھی اور وہ محبت بھری شگفتہ مزاج عرفیہ ان کی اپنی شخصیت میں کہیں دب گئی تھی اب تو وہ صرف اور صرف اپیا بن کے رہ گئی تھیں صرف عُظمیٰ ہی کی نہیں، سارے زمانے کی ۔ ۔ اور انھوں نے اس رشتے کا بھرم کچھ اتنا نبھایا کہ اب یہ رشتہ ان کے نام کی جگہ اُن کی شناخت بن گیا تھا۔

اپنی شخصیت کا بھرم اور مزاج کی سنجیدگی سنبھالتے سنبھالتے اپیا بھول ہی گئیں کہ دل کے کسی گوشے میں ابھی وہ لو بجھی نہیں جسے ایک عام عورت کی طرح چاہے جانے کی چاہ ہے۔ تب ہی تو ذکریا رومی کے نام کو وہ اور مردوں کے نام کی طرح سن کر گزر نہیں جاتیں بلکہ چراغ پا ہو جاتی تھیں۔ یہ بھی محبت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔ شاید اپیا نے کبھی اپنے جذبات کا تجزیہ نہ کیا ہو اور پیار کی بھوکی عرفیہ کو اپنے اندر زبردستی دبا کے رکھا ہو یا پھر ۔ ۔ ۔ وہ شاید بنتی رہی ہوں۔ مگر جو بھی ہوا ایسا کرنے میں اکیلی اپیا ہی قصوروار نہیں تھیں۔ یہ تو وقت اور حالات کا گٹھ جوڑ تھا جس نے پیار اور محبت کی مورتی عرفیہ کا پیار پر سے بھروسا اٹھا دیا تھا۔ بس ایک لمحے میں ۔ ۔ وہ اُس ایک لمحے کو قید نہ کر سکیں جو ریگستان کی آندھی کی طرح

ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گیا اور وہ ــــــ ؟ وہ لوسف اپنی آنکھوں سے ربت کے ذرّے صاف کرتی رہ گئیں۔ وہی ایک لمحہ تعاجب معصوم سی عرفیہ نفرت کے بوجھ تلے دب گئی، اور اس کی جگہ بارعب اپیا نے لے لی۔ محبت کے نقوش بھی کتنے گہرے ہوتے ہیں ــــ! وقت وحالات کے تقاضے سیلابی زوؤں کی طرح اوپر سے گزر جاتے ہیں پھر بھی تاحیات دھندلے دھندلے ہی سہی باقی رہ جاتے ہیں۔ تب ہی تو ہزار کوشش کے باوجود وہ اس لمحے کو فراموش نہ کرسکیں ــــ اور وہ لمحہ جوں کا توں مقیّد رہ گیا ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں۔

شام کا سانولا چہرہ برقی قمقموں کی جھالر لگا ڈوپٹا اوڑھ کر نکھر اُٹھا تھا۔ زرق برق کپڑوں کی سرسراہٹ، کھنکتے قہقہے اور عطر بیز فضا میں ماحول مدہوش کن ہو رہا تھا۔ فنکشن ہال مہمانوں کی بہتات سے پٹا پڑ رہا تھا۔ ہم مزاج لوگوں کے گروہ در گروہ ٹکڑوں کے آگے سماں باندھ رہے تھے۔ کوئی فقرہ بازی میں مست تو کوئی بادہ خواری میں مگن۔ کچھ فاصلے پر ریکریشن ہال میں مدّھم سی زرد روشنی میں مغربی دُھن پر تھرکتے انجانے جوڑے۔ یہ سب وہ کاہے کو دیکھنے گئی تھیں۔ انھیں تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ قانون کی ماسٹرز ڈگری رکھتے ہوئے بھی وہ سری اجڈ ہیں گنوار! وقت کتنا آگے نکل گیا تھا ــــ! گھر سے عدالت اور عدالت میں حق و باطل کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جدوجہد۔ اسی اُدھیڑ بُن میں انھوں نے دیکھا ہی نہیں کہ وقت کی چال کتنی بدل گئی!

انھوں نے محسوس کیا کہ انھوں نے خود سے انصاف نہیں کیا۔ کس قدر پچھڑی ہوئی ہیں وہ ــــ! پھر انھوں نے اپنا موازنہ مختلف لڑکیوں سے کیا جو نہایت اطمینان سے لڑکوں کے ہاتھوں استعمال ہو رہی تھیں جیسے اپنا پیدائشی حق استعمال کر رہی ہوں۔ سماج لیکن الٹا لڑکیوں کو ہی سرزنش کرتا ہے۔ پھر۔۔۔ انھوں نے خود اپنے اطراف یہ کیسی ریکھا کیوں کھینچ لی ــــ! وہ اپنے اور برعکس عمل کرتی رہیں اور ہر طرح خود کو موجودہ نظام میں ضم کرنے کے لئے مدلل وجوہات ڈھونڈتی رہیں۔ مگر ہر بار وہ اپنی دلیلوں کے آگے سپر انداختہ ہو جاتیں، کیونکہ ہر بار فیصلہ کرنے سے قبل ان کا ضمیر اس نظام کی مُداہنت کے لئے آگے بڑھ جاتا ــــ ' حجاب دور حجاب ــــ آلودہ نگاہوں کا وار ایک الگ حربہ ہے۔ اس کی مثال اس ہیرے جیسی ہے جو ہر جوہری کی دکان پر دستیاب نہیں ہوتا۔ اُس حُسن کا ذکر ہی کیا جو راہ چلتے ہر مرد کی نگاہوں سے ٹکرا کر گھس گیا ہو ــــ حُسن ہو تو ایسا۔ ان کے ضمیر نے خود اُس کی سبیہ کو اُس کے مقابل کھڑا کیا تو وہ

شرم سے پانی پانی ہوگئیں ۔ سانولی سلونی رنگت، کمانی ابرو خاموش جھیل جیسی بڑی بڑی آنکھیں یہ آنکھیں ہی تو تھیں جو ان کے لئے وبال بن چکی تھیں۔ رومی نے تو کہا تھا ہے کس بلا کا جادو ہے اِن آنکھوں میں ۔ دیوی جی ! خدا کے لئے ادھر کم ہی دیکھا کریں ورنہ یہ بندہ تو ڈوب جائے گا۔"

"ہیلو عرفہ ۔ اکیلی بیٹھی ہو ۔ چلو ادھر چلتے ہیں۔" اُن کا کوئی کُلیگ تھا جو انھیں اکیلا دیکھ کر ان کے قریب آگیا تھا ۔ یہ کوئی پہلی پیشکش نہیں تھی ۔ اب تک بیسیوں ساتھیوں نے انھیں اپنے ساتھ بیٹھنے کا مشورہ دیا تھا ۔ مگر وہ سب کو ٹالتی رہیں ۔ وہ پریشان تھیں کہ خود کو کس ٹولی میں شامل کریں وہاں تو سب ہی ایک دوسرے میں گُھتّھے ہوئے تھے ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ خود کو اس ماحول کے مطابق نہیں پاتی تھیں ۔

ہمیشہ ہی وہ اس طرح کی دعوتوں سے پرہیز کرتی آئی تھیں ۔ مگر اس بار وہ ٹال نہ سکیں کیونکہ یہ اس سیشن جج کی دختر کی شادی پر دیا گیا عشائیہ تھا جس سے وہ خود وابستہ تھیں ۔ پھر دولہا بھی انہی کے ساتھ کام کرتا تھا ۔

شومیٔ نصیب کہ وہ جہاں بیٹھی تھیں وہاں سے سارا ماحول ان کی نگاہوں کی زد میں تھا ۔ کبھی کبھی ان کی نظریں بال روم فلور کی طرف اٹھ جاتیں تو ان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی "اللہ توبہ" وہ اپنے دماغ کی رَو کو جھٹک کر دوسری طرف خود کو مصروف کرنے کی کوشش کرتی رہیں مگر نظر آخر نظر ہے بھٹک بھٹک کر پھر اُسی جوڑے پر جمتی رہی، جس کی طرف سے وہ نظریں چرا رہی تھیں ۔ عورت ان کی نگاہوں کا مرکز بس تھی، وہ تو اُس مرد پہ نظر پڑتے ہی پریشان ہو رہی تھیں جو ان کے اپنے رومی سے ملتا جلتا تھا ۔

"ہزار بار توبہ ۔ اب ہرگز نہیں دیکھوں گی" انھوں نے اپنے تئیں عہد کر لیا کیونکہ مارے گھبراہٹ کے سارے جسم میں جُم جُم ٹھنڈی بوندیں ابھرنے لگی تھیں، اور آنکھیں ستمبر کے آسمان کی طرح بھیگنے لگی تھیں ۔

"میں بیکس ہو رہی ہوں" انھوں نے اپنے آپ کو ٹٹولا ۔

"نہیں ــ میں گنوار ہوں" انھوں نے خود ہی اپنا تجزیہ کر لیا، اور بہتری اسی میں جانی کہ وہاں سے نکل چلیں ۔ پھر خیال ہوا کہ میزبان سے ملے بغیر جانے سے تو آنے کا مطلب ہی فوت ہو جائے گا ۔

اب اُن کی نگاہیں ہر طرف جج صاحب کو تلاش کرنے لگیں ۔ مگر وہ جج صاحب کو

ڈھونڈیں بھی کہاں ــــ ! جدھر بھی نگاہ اٹھتی کسی نہ کسی کو اپنی طرف دیکھتا محسوس کرتیں ۔
" اُف قسم خدا کی مرجاتا جو ذرا آنچل میں پناہ ملتی ــــ ! " کسی منچلے نے فقرہ کسا اور ان کی بھنویں تن گئیں ۔
" کم از کم اظہار کی آزادی تو ہے اس ملک میں ۔ حق رائے دہی THE RIGHT OF FRANCHISE
کیوں محترمہ ــــ ؟ " اُس نوجوان نے ہاتھ
جوڑ کر کہا تو عرفیہ کو اپنی غلطی پہ ندامت ہوئی ۔
" ہائے ــــ عرفی ! " اپنے ہی خیالوں کے جھرمٹ میں حیران و غلطاں تھی کہ کسی کے آواز دینے پر وہ بوکھلا گئیں اور پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو اوسان خطا ہو گئے ۔ اجڈ گنوار کی طرح منہ کھولے وہ اُس جوڑے کو دیکھتی رہیں جسے کچھ دیر قبل وہ ڈانس فلور پہ دیکھ چکی تھیں ۔
" ارے ــــ کدھر کھو گئی ۔ میٹ (MEET) مسٹر زکریا رومی ۔ اور مسٹر رومی یہ میری کالج میٹ (MATE) ہے عرفیہ ۔ قانون کی ماسٹر ڈگری رکھتی ہے ۔ مگر ایک خاص بات ہے اس کے مزاج کی ۔ یہ صرف سیاہ کوٹ پہن کر ہی نڈر بن سکتی ہے ۔ سیاہ چغہ اتارتے ہی عدالت کا یہ تناور درخت ایک دم چھوئی موئی کا بودا بن جاتا ہے ۔ ارے ــــ یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ــــ ؟ ! "
ونیتا کو کیا پتا تھا کہ عرفیہ پہ کیا قیامت ٹوٹی ہے اور وہ ان باتوں سے بے خبر ، حیران و پریشان کبھی عرفیہ کو دیکھتی رہی تو کبھی رومی کو ۔ اس تماشے میں اگر کوئی مطمئن تھا تو وہ تھا رومی کیونکہ عرفیہ کی پریشانی دیکھ کر اس کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی تھی ۔ اس نے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھائے گا ۔ لہٰذا ایک اجنبی کی طرح کسی قسم کا تاثر دیئے بغیر خاموش کھڑا رہا ۔ آخر ونیتا سے ہی رہا نہ گیا ۔
" عرفیہ ــــ میں نے کہا یہ مسٹر زکریا رومی ہیں ۔ فلورس کلاتھ مل کے مالک ۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں "
رومی نے بڑے تکلف سے عرفیہ کے آداب بجا لایا اور عرفیہ کا ہاتھ بھی بے خیالی میں جواب کے لئے اٹھ گیا ۔ رومی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا ۔ اُسے تو اچانک حکمت مل گئی ۔ مگر عرفیہ ــــ ؟ اس کی زندگی منتشر ہو گئی ۔
" رومی جتنے خوب صورت ہیں اُس سے کہیں زیادہ خوب صورت اُن کا مزاج ہے ۔ یہ بہترین ڈانسر بھی ہیں ۔ اور ہاں یہ بہت پھر تیلے ہیں ۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں ۔ میں نے جہاں جہاں اپنے ڈانس
ملو

پروگرام دیئے ہیں وہاں وہاں وہ اکثر مل جایا کرتے تھے۔ ابھی پچھلے ماہ ہمارا ڈانس کنسرٹ ہانگ کانگ گیا تھا وہاں یہ مسٹر اچانک مل گئے۔ پھر تو ــــ اف رومی ــــ میں بھول نہیں سکتی وہ سماں"
فرطِ جذبات سے وینیتا کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ عرفیہ نے محسوس کیا کہ وینیتا کی حالت اُس ننھے بچے کی سی ہو گئی ہے جسے اچانک دیوار پر کوئی چڑیا سیٹی گئی ہو۔ پھر عرفیہ نے دیکھا کہ وینیتا کا سر آہستہ آہستہ رومی کے سینے پر جھکنے لگا۔
"آہ ــــ رومی ــــ رومی ــــ" جذبات اب سرگوشی میں پگھلنے لگے تھے۔
"میں نے تم کو مِس کیا رومی ــــ واقعی مِس کیا" وینیتا نے نیم باز گلابی آنکھوں سے ایک نظر رومی کی طرف دیکھا اور سر اُس کے سینے پر رکھ دیا۔ وینیتا کی اس جذبات انگیزی پر رومی ہکا بکا ہو کھلا گیا۔ اس نے ایک نظر عرفیہ کی طرف دیکھا جس کی پیشانی پر شبنم جھلملانے لگی تھی اور وینیتا کو پرے ڈھکیل دیا۔
"اوہ ــــ سوری رومی" میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ وینیتا ایک دم ہوش میں آ گئی۔ مگر جوں ہی اس کی نظر رومی کی طرف اٹھی اس نے دیکھا کہ وہ پشیمان نظروں سے عرفیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور عرفیہ خود بھی بڑی لوکھلائی ہوئی لگ رہی تھیں۔
"ارے ــــ یہ تم دونوں کو کیا ہو گیا ــــ! عرفیہ ــــ رومی ــــ" حیران ہو کر اُس نے باری باری دونوں کو پکارا۔
"اوہ ــــ مسٹر آہوجہ ــــ!!" شاید اس کی نظر کسی اور مرد پر پڑی۔
"اچھا مسٹر رومی۔ ایکسکیوزمی" بڑی بے پروائی سے وہ اُن دونوں کو چھوڑ کر ہلکی سی ناچ اپنہ مسکراہٹ بکھیرتی مِس مرد کی طرف چلی گئی۔
دھات اسے فلرٹ ــــ!!! ایک اور مرد کی کمر میں باہیں ڈالے جاتی ہوئی وینیتا کو پیچھے مڑ کر وہ بڑی دور تک دیکھتا رہا۔
"تف ہے اس لڑکی پر ــــ یوں جان کو آجاتی ہے۔ دراصل یہ لڑکی ــ ارے ــ" اس نے اپنے اطراف نظر دوڑائی۔ مگر عرفیہ اُسے کہیں نظر نہ آئی۔ ہجوم کو چیرتا ہوا وہ ادھر اُدھر عرفیہ کو ڈھونڈتا رہا۔ اُسے لگا۔ جیسے عرفیہ نہیں بلکہ اس کی اپنی زندگی کہیں گم ہو گئی ہے وہ عرفیہ کو خوب جانتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے بروقت عرفیہ کے دماغ سے اندیشوں کو پاک نہ کیا تو زندگی بھر کے لئے اسے سمجھا نہ پائے گا۔ وہ جانتا تھا اس اچانک جانے کا سے پکڑ ہی گئی، ہاتھ لگی۔

عرفیہ کے دل پر کیا اثر ہوا ہوگا تب ہی تو وہ عرفیہ سے ایک بار ملنا چاہتا تھا۔ مگر عرفیہ نے شاید یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب رومی نام سے اس کی کوئی وابستگی نہیں رہی۔ وہ عرفیہ سے ملنے عدالت بھی گیا مگر وہاں انھوں نے رومی کی وہ تحقیر کی کہ کئی دن تک وہ اپنی شکل خود نہ دیکھ سکا۔

ہنستا کھیلتا کھلنڈرا اور شرارتوں کا شہنشاہ رومی ایک دم خاموش ہو گیا۔ حالات کو دوبارہ استوار کرنے کے لئے اس نے ہزار جتن کئے۔ اپنے ملازم منظور سے اس نے معافی نامہ بھیجا مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ عرفیہ نے تو ان چٹھیوں کو چھوا تک نہیں۔ آخر رومی کا قصور بھی کیا تھا۔ وہ مزاجاً ہی سر پھرا تھا اور عرفیہ کے آگے تو اور بھی شریر بن جایا کرتا تھا۔ اس دن محض عرفیہ کی پریشانی سے محظوظ ہونے کے لئے اس نے اچانک رونما ہونے والے حادثے کا ساتھ دیا تھا۔ ورنہ وہ کہاں اور رونیتا کہاں ۔۔۔ عرفیہ اُس کی زندگی تھی اس کی جنت۔ وہ اپنی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش میں اپنی خودی کو تک فراموش کر چکا تھا۔ ایک دن تو اس نے اپنی بھاوج کو بھی عرفیہ کے گھر بھیجا کہ مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے مگر اس دن عرفیہ نے حد ہی کی کہ اپنے کمرے کا دروازہ تک نہ کھولا۔

عرفیہ بذاتِ خود بے حد ضدی اور انا پرست تھیں۔ بچپن ہی سے انھوں نے اپنی ضد کے سہارے اپنی ہر خواہش کی تکمیل کی تھی۔ اپنے لئے وکالت کا پیشہ تجویز کرنا بھی ان کی اسی عادت کا نتیجہ تھا۔ ورنہ تو ان کا گھرانہ بڑا قدامت پرست تھا۔

بجز اس ایک کمزوری کے وہ نہایت نیک طینت اور خدا پرست تھیں۔ بہت زیادہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو سماج کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ رومی ان کا بچپن کا دوست تھا۔ جوانی کی حد میں داخل ہوتے ہوتے انھوں نے بچپن کی محبت کو کسی اور رنگ میں دیکھا تو بس دل وجان سے اُسی کی ہو گئیں۔ رومی کو وہ اپنی زندگی کا انعام سمجھتی تھیں اور اُس سے بھی اتنے ہی پیار کی امید رکھتی تھیں۔ مگر ۔ ۔ ۔ رومی کو اپنی نگاہوں کے سامنے ایک اور لڑکی سے فلرٹ کرتا ہوا دیکھا تو انھیں لگا کہ انھیں بھی دل وجان سے چاہنے کا وہ محض ناٹک کرتا ہے۔ درحقیقت ان کے ساتھ بھی وہ فلرٹ ہی کرتا ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ کسی مرد کو منہ نہیں لگائیں گی۔ حالانکہ رومی کو بھولنا ان کے لئے انتہائی سنگین مرحلہ تھا۔ کئی بار ان کے ارادے متزلزل ہوئے۔ استقامت لڑکھڑائی کہ وہ رومی کو معاف کر دیں۔ اس کے لئے نہ سہی خود اپنے لئے۔ کیونکہ وہ رومی کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر ایسے وقت اُن

کی ا ما اڑے آجاتی اور اُن کے پیشے کی سا کھ ان کی انا پرستی کو اور تقویت بخشتی ۔حالات کی سنگینی کا اثر ان کی دفتری زندگی پر بھی پڑا۔ ازدواجی زندگی سے علیحدگی کے لئے آئی ہوئی کئی درخواستوں کو انھوں نے ٹال کے رکھا ہوا تھا کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ناراض جوڑوں میں خود ہی صلح صفائی ہو جائے اُن ساری درخواستوں میں انھوں نے طلاق کی نوٹسیں جاری کروا دیں ۔ انھیں نفرت ہو گئی تھی۔ مرد ذات سے اور اس خیال سے کہ عورت بنا سہارے کے مر جائے گی ۔

"اپیا ــــ اپیا۔ دروازہ کھولو" عظمیٰ زور زور سے دروازہ پیٹ رہی تھی ۔

"کیا بات ہے؟" انھوں نے جھلا کر دریافت کیا ۔

"دیکھو تو کون آیا ہے ۔!" عظمیٰ نے صحن کی طرف اشارہ کیا جہاں منظورے کھڑا اپنے دانتوں کی نمائش کر رہا تھا ۔

"او ئے منظورے ۔ بتا کیا نے گا میرا پیچھا چھوڑنے کا؟"

"فی بی جی ۔ میں حکم کا بندہ۔ کچھ لینے نہیں آیا۔ صاحب کہتے ہیں اگر اس بار انھیں چٹھی کا جواب نہ ملا تو وہ خود یہاں آجائیں گے ۔

"واہ رے زبردستی ــــ! آخر وہ خود کو ۔ ۔ ۔" وہ جملہ مکمل نہ کر سکیں۔ دل کے کسی گوشے سے پیار کی لہر اٹھی بھی تو اُن کا انداز خود سپردگی تھا جو اُن کے دل میں کہیں کسک بن کے رہ گیا تھا۔ مگر نفرت کا جذبہ اس قدر غالب رہا کہ دل کی آواز کو زبان نہ مل سکی اور یوں ۔ ایک بار پھر وہ زندگی سے ملتے ملتے رہ گئیں ۔

"تم جاؤ منظورے ۔ میں اس کا مزاج درست کئے دیتی ہوں" اماں بی نے منظورے کو واپس لوٹا دیا اور خود ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اپیا کے کمرے میں گھس پڑیں ۔ عظمیٰ بھی گھبرائی گھبرائی ان کے پیچھے لپک کر اندر پہنچ گئی ۔

"لڑکی ــــ! تونے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے ــــ! بڑی افلاطون بنی پھرتی ہے۔ کچھ دیر قبل رومی کی بھاوج آئی تھیں ۔ میں نے انھیں زبان دے دی ہے۔ کان کھول کر سن لے۔ تیری شادی ہوگی اور رومی سے ہوگی۔ تو نے مجھے خوب نچا لیا۔ مگر اب مجھے ہوش آگیا ہے۔ بڑا گھمنڈ ہے تجھے اپنے آپ پر۔ مگر یاد رکھ عورت کی ضد ایک دن خود اسی کے لئے آہنی شکنجہ بن جاتی ہے۔ جس دن تو یہ بیڑیاں تنگ ہوتی محسوس کرے گی بہت تلملائے گی ۔ لیکن تو انھیں کاٹ نہ پائے گی کیونکہ انھیں کاٹنے والی دھار تو وقت کے ہاتھ ہوگی ــــ اور وقت ــــ بہت دور

نکل چکا ہوگا۔ خود پہ نہ سہی کم از کم میری بوڑھی ہڈیوں پہ تو رحم کر۔ یہ سچ ہے میں نے تجھے اپنی کوکھ سے پیدا نہیں کیا۔ اپنا خونِ جگر دے کر تجھے پالا تو ہے۔ اتنی چھوٹی سی تو چھوڑ کر مری تھی تیری ماں۔ اس بار میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تیری شادی میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ یاد رکھ"
شدتِ غم سے اماں بی کا کمزور بدن کانپنے لگا اور وہ آگے پیچھے جھولنے لگیں۔ اگر عظمیٰ دوڑ کر انھیں سنبھال نہ لیتی تو وہ چکرا کر گر پڑتیں۔ ضعیف نانی ہچکیوں سے روتی رہیں اور وہ خود پہ لعن طعن کرتی رہیں۔

"آج مجھے پتہ چلا۔ میری محنت رائیگاں گئی۔ آخر کو میں تیری ماں نہ بن سکی"
"ایسا نہ کہو اماں بی۔ خدا کے لئے ــــ" اماں بی سے لپٹ کر وہ بے تحاشہ رونے لگیں۔
"کہہ دو اس منظورے والے کو کہ میں تیار ہوں"

مرفیہ کے ہاں کہنے کی دیر تھی۔ سوگوار فضا لمحہ بھر میں خوش گوار ہوگئی۔ دونوں گھروں میں خوشیوں کے تبادلے ہوئے۔ عظمیٰ تیاریوں میں ایسی الجھی کہ اسے اپنا ہوش نہ رہا۔ صرف چار دن میں شادی کی تیاریاں مکمل کرنی تھیں۔ اماں بی کے ناتواں ہاتھوں میں برقی قوت آگئی تھی۔ گھر کے در و دیوار سے خوشیوں کی کرنیں پھوٹنے لگی تھیں۔ مگر۔ - ۔ اتنی ساری خوشیوں میں اگر کوئی شامل نہ تھا تو وہ ــــ خود عرفیہ تھیں۔

دن پر لگا کر اڑنے رہے۔ مگر وہ اپنی الجھن کو سلجھا نہ سکیں۔ رومی سے شادی کے لئے ہاں کر کے انھوں نے اماں بی کی بات کی لاج تو رکھ لی مگر خود ان کی انا بری طرح متاثر ہوگئی تھی۔ جتنا وہ سوچتی رہیں اتنا ہی الجھتی رہیں، وہ پریشان تھیں کہ وہ رومی جیسے گھاگ انسان کے ساتھ کیسے نباہ کر سکیں گی۔ کتنی صفائی سے وہ اپنا اُلّو سیدھا کرتا رہا۔ خود تو فلرٹ کرتا رہا اور وہ اس پر جان نچھاور کرتی رہیں۔ اگر وہ سیدھی سادی لڑکی ہوتیں تو شاید ونیتا کی ملاقات کو حادثے پر محمول کر کے اسی دھوکے کے سہارے جی تو سکتی تھیں۔ مگر آئے دن ایسے ہی کرداروں سے نمٹتے نمٹتے وہ خود کو اپنے خوش گوار دھوکے میں بھی نہیں رکھ سکتی تھیں۔ سب کچھ جانتے ہوئے انھوں نے ایسا کیوں کیا ــــ!

"اماں بی کی لاج رکھنے کے لئے ــ" انھوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے لیا۔ مگر زندگی تو انھیں خود جینی تھی۔ پھر ــــ پھر کیا کیا جائے ــــ!!

کتنی دیر سے وہ اپنے کمرے میں بند پڑی تھیں رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ لوگ مشینوں

کی طرح تیاریوں میں جٹے ہوئے تھے۔ اماں بی ذو پٹے کا رہا سہا گوٹا مکمل کرنے میں ساری توانائی صرف کر رہی تھیں۔ عظمیٰ رت جگے کے گلگلے منہ میں ٹھونسے ادھر اُدھر دندناتی پھر رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں اس کے ساتھ کام میں اُس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

"آخر اس رومی کے بچے نے اپنی دولت کے بل بوتے پر اماں بی کو خرید ہی لیا۔!" غصّہ میں کروٹ بدل کر وہ پھر سے نیند کو آزمانے لگیں مگر نیند اُن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ان کے جسم میں خون کھولنے لگا۔ گھبراہٹ پر قابو پانے کے لئے وہ اب تک دو تین گلاس پانی پی چکی تھیں مگر غصہ تھا کہ اور بڑھتا ہی رہا۔ سونے پر سہاگہ کہ اتنے میں عظمیٰ نے اپنی ایک سہیلی کو ونیتا کہہ کے پکارا۔ ونیتا کا نام سنتے ہی اُن کا پارہ چڑھ گیا۔

"میں اس کی دولت کو سجدہ نہیں کروں گی۔ آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔! میں دھوکہ کھا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ یا اللہ ــــ! یہ میں کس جھمیلے میں پڑ گئی ہوں ــــ!" کنپٹی میں اٹھتی درد کی ٹیس سے بے قابو ہو کر انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"میں عام لڑکیوں کی طرح اپنے آپ کو حالات کے سپرد نہیں کر سکتی ــــ" پھر انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ گھر والوں کو ساری حقیقت بتا دینی چاہئے کیونکہ وہ رومی سے بدستور نفرت کرتی ہیں اور نفرت وہ شدید جذبہ ہے جو دل کے نہاں خانوں میں چھپے ہر جذبے پر غالب آجاتا ہے۔ اور وہ شادی جیسے مقدس رشتے کو جس کی بنیاد ہی محبت اور وفا پر ہے ہرگز داغدار ہونے نہیں دیں گی ــــ انھوں نے آہستہ سے دروازے کا پٹ کھولا۔

"اُف توبہ! کیا غُل غپاڑا مچا رکھا ہے اس عظمیٰ کی بچی نے"

دروازے کی جھری سے انھوں نے دیکھا عظمیٰ اپنے ہاتھوں میں پھول کے گجرے باندھے ڈھولک پر بیٹھی ہے اور اس کی سہیلیاں اطراف بیٹھی کسی اچھے گیت کا انتخاب کر رہی ہیں۔

"اری لڑکیو اب شروع بھی ہو جاؤ۔ کیا یوں ہی صبح کر دو گی" پان کی پیک کو اندر دھکیلتے ہوئے اماں بی نے کسی اذان دیتے ہوئے موذن کی طرح للکارا تو لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ "کتنی خوش ہیں اماں بی ــــ! اب کیا کہوں اُن سے ــــ! وہ یہ صدمہ برداشت کر سکیں گی۔؟ مگر رومی کے ساتھ تو میں جی نہ سکوں گی ــــ مر جاؤں گی۔ تو کیا وہ صدمہ اماں بی برداشت کر لیں گی ــــ؟ نہیں وہ صدمہ تو اور بھی شدید ہوگا ــــ پھر ایسی سزا میں اپنے آپ کو کیوں دوں ــــ؟؟ سزا تو رومی کو ملنی چاہیئے۔ ہاں میں بدلہ لوں گی رومی سے ــــ

وہ سی ایسا کہ، اس مرد کے بچے کو تاحیات یاد رہے گا کہ عورت بھی کس حقیقت کا نام ہے — اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا — ہاں — ایسا بدلہ لوں گی کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی اس کی انا ۔ جیسے میں بکھر گئی ہوں "

اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے سے قبل وہ اٹھیں اور سفید اونی شال اوڑھ کر تاریکی میں گھل گئیں ۔ ڈھولک کی تھاپ ۔ لڑکیوں کے قہقہے اور اماں بی کے چٹکلوں نے بہت ان کا راستہ روکا ۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہیں ۔ یہی تو اُن کی شخصیت کی پہچان تھی — پھر انھوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ وہ ملک چھوڑ کر تھوڑے ہی جا رہی ہیں ۔ یہ قدم تو وہ محض اس رومی کے بچے کو زک دینے کے لئے اٹھا رہی ہیں ۔

گیارہ بجنے میں کچھ منٹ اور باقی تھے ۔ وہ تیزی سے ٹکٹ گھر پہنچیں ۔ اناؤنسر ریل کی آمد کی اطلاع دے رہا تھا ۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی وہ پلیٹ فارم پر آگئیں ۔ اٹیچی نیچے رکھ کر انھوں نے سال کے کونے سے اپنا سینہ جکڑ لیا ۔ قریب آتی ہوئی ریل کو دیکھ کر ان کے احساس و فرض میں زبردست جنگ شروع ہو گئی ۔

"اماں بی اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکیں گی ۔ کیا میں ان کی خاطر یہ نہیں کر سکتی کہ اپنا فیصلہ بدل لوں اور آہستہ آہستہ زندگی کا زہر پی لوں — مگر ۔ ۔ ۔ رومی تو سمجھے گا کہ عورت آج بھی مسالے کی طرح جہیز کی طرح خریدی اور بیچی جاتی ہے ۔ جبکہ آج بھی مرد کی ہوتی ہے — نہیں — جیت اس بار میری — میری ہو گی "

ریل اب پلیٹ فارم پر رک گئی تھی ۔ لوگ ایک دوسرے کو وداع کر رہے تھے ۔

"بیٹا مجھ بوڑھی پر رحم کرنا ۔ اپنی حیثیت کی کیفیت دیتی رہنا ۔ تیرے سوا اب میرا اس دنیا میں ہے ہی کون — ! مجھے بھول نہ جانا —" ایک بڑھیا آنسوؤں کے درمیان اپنی وداع ہوتی ہوئی بیٹی سے کہہ رہی تھی ۔ اس تڑپتی بلکتی ماں کی صورت میں انسے اماں بی کا چہرہ گھومتا دکھائی دیا ۔ پژمردہ چہرہ — لٹا اور بے بس چہرہ — آنسوؤں سے تر بتر چہرہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا — "آخر تو نے میرے منہ پر کالک پوت دی — کیا ہوا جو اپنا خون دے کر پالا — آخر میں تیری ماں نہ بن سکی "

"نہیں نہیں اماں بی " بے خیالی میں وہ بلند آواز میں کہہ گئیں ۔

"کیا نہیں نہیں محترمہ — سوار ہو جائیے ۔ گاڑی کو سگنل مل چکا ہے " گارڈ اپنی ہری جھنڈی لہراتا

ہوا گویا ہو۔ عرفہ کی کشادہ پیشانی پر پسینہ موتیوں کی طرح جھلملانے لگا۔
"معاف کیجیے۔ ابھی کچھ سیکنڈ لگی ہیں۔ گاڑی اب چھوٹنے ہی کو ہے"
گارڈ ان حیران سا تھا۔ سیٹی ہوئی ــــ اور۔۔ گاڑی سرکنے لگی۔

یہ میں نے کیا کیا۔۔ کیوں کیا؟ اب کیا کروں گی؟؟ ہزاروں سوال چاروں طرف سے ان پر یلغار کرنے لگے۔ دونوں ہاتھوں سے انھوں نے سر دبا لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں کیونکہ ان کی آنکھوں کے آگے دھندھ سی ہو رہی تھی۔ پھر انھوں نے سوچا کہ لمبرٹ فارم چھوڑ دینا چاہیے تیزی سے انھوں نے نیچے رکھا ہوا اٹیچی کیس اٹھا لیا اور لوٹ جانے کے لئے پلٹیں۔ لگتا تھا لمبرٹ فارم کا تختہ اور اس پر کسی نقش پا کے ان کے سر پکڑ رہا ہے اور گھر کے در و دیوار ان کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

۱۴/ اپریل ۹۰ء

قمر جمالی

اس اوبڑکھابڑسی لڑکی کی اناپ شناپ
حرکتوں پر اب میں جھنجھلانے لگی ہوں۔ ناک میں
دم کر رکھا ہے اس نے۔ یہ تو بھلا ہوا اس آدم قد
لہر کا کہ اسے پرے ڈھکیل کر ریت پر سلا دیا۔
ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ یہی نہیں۔ ہمیشہ سے
اس کا یہی وطیرہ رہا ہے۔ بات بے بات پرے پرے
نکل جاتی ہے تو صدیوں یہاں وہاں بھٹکتی رہتی
ہے۔ کل ہی کی بات ہے جب ہم سکندرآباد
اسٹیشن پر اپنا مطلوبہ ریزروڈ کمپارٹمنٹ ڈھونڈ
رہے تھے کہ یہ اچانک ہم سے الگ ہو گئی۔
اور جب ہم نے اپنا مطلوبہ کمپارٹمنٹ دریافت
کر لیا اور اندر قدم رکھا تو یہ پہلے ہی سے اس
میں موجود تھی۔ مجھے دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس پڑی
اور نو دو گیارہ ہو گئی۔ یہ اتنی تیز گام ہے کہ ہمیشہ
وقت سے پرے سفر کرتی ہے۔ ایک صدی
آگے ــــ یا پھر ایک صدی پیچھے۔

پچھلے سال جب ہم جے پور ٹور پر تھے اور
گھومتے گھامتے شیش محل میں قدم رکھا، کہ یہ
سٹراپ سے نکل گئی۔ پھر جو میں نے آنکھیں
کھولیں تو شیش محل کے اِنچ اِنچ پر اُسی کی
شبیہ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ مہارانی سا جاہ
وحشم، زربفت کا گھاگرہ چولی، اور ٹشیش کے
کنارے کی اُوڑھنی، میں اس کا تزک دیکھ کر
میری آنکھیں ٹھہر گئیں۔ دراصل پرانے محلات
کے کھنڈروں میں پہنچ کر مجھے نہ جانے کیا ہو جاتا

ہے۔!! میرے قدم رکھتے ہی کھنڈر اپنی تہذیب بولنے لگتے ہیں ــــ اور صدیوں کی موٹی پرتیں میری پتلیوں سے چپک جاتی ہے۔ جن سے چھٹکارا پانے کے لیے مجھے بڑی جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔

صبح جب ہم گوا (GOA) ٹور کے لیے نکل رہے تھے، تب ہی مجھے اندازہ تھا کہ آگے پیچھے صدیوں میں ڈولنے والی یہ لڑکی مجھے بڑا ستائے گی

ابھی ہم اپنا اسٹیٹ چھوڑ کر کرناٹک اسٹیٹ میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ہبلی اسٹیشن سے دھاروار (DHARWAR) کے بیچ یکایک گاڑی رک گئی۔ اطراف سے مختلف قسم کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ گاڑی پر دہشت گردوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ گوا جانے والی بس بھی ایک واحد بوگی ہوتی ہے جسے آندھرا پردیش اسٹیٹ سے کرناٹک جانے والی ایکسپریس ٹرین سے لگادیا جاتا ہے۔ کرناٹک اسٹیٹ کی حد چھوڑتے ہوئے اس بوگی کو واسکو۔ وجیا نگر ایکسپریس (VIJYA NAGAR EXPRESS) سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ ساری گاڑی میں چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر اکثریت کنڑ بولنے والوں کی تھی، اس لیے کچھ پلے نہ پڑتا تھا۔ چونکہ پورا کمپارٹمنٹ ہمارے حق میں ریزرو تھا اس لیے ابتدائے سفر ہی سے ہم نے اپنے کمپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا، اگرچہ کھلی کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ مگر جوں ہی گڑبڑ کا احساس ہوا ہم نے وہ بھی گرا دیں۔ اب اندر ہی اندر میں دافعِ بلا کے لیے دل ہی دل میں کلامِ پاک کی مقدس آیتوں کا ورد کر رہی تھی تو میرے میاں اپنے بچپن کی بہادری کے قصے یاد کر کے اپنے آپ میں طاقت اور ہمت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ بیٹیوں بچیاں اوپر کی برتھ پر چھپکلیاں کی طرح چپک گئی تھیں۔ یکایک ہمارے کمپارٹمنٹ کا دروازہ اور زور پیٹا جانے لگا۔ میرے میاں آگے بڑھ کر چٹخنی گرانا ہی چاہتے تھے کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا... کہ میں نے زور سے دھکا دے کر انہیں سیٹ پر بٹھا دیا یہ سوچ کر کہ اگر یہ بچ جائے تو بچیوں کا سہارا بنے رہے گا۔ مگر... جوں ہی میں نے دروازہ کھولا اور اپنے مقابل خوش باش نوجوان لڑکوں کو دیکھا تو میرا خوف جاتا رہا۔ ابھی میں اپنے حواس میں واپس ہوئی بھی نہ تھی کہ وہ دھم سے نیچے کود گئی۔ میں بے اختیار دروازے تک اس کے پیچھے لپکی اور مارے گھبراہٹ کے وہیں گر گئی۔ وہ لڑکے بھی یکلخت

میرے پیچھے لوگوں کے دروازے تک آئے اور مجھے سہارا دے کر واپس میرے کمپارٹمنٹ تک لے گئے۔

"کیا ہوا آنٹی ---؟" وہ اپنی حیرانی دبا نہ سکے

"وہ --- !" وہ .... گاڑی کے نیچے آجاتے گی..."

"کون --- !" انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر میرے شوہر سے مخاطب ہوتے۔ جو سرا سیمہ یہ سب دیکھ --- نہیں دیکھ نہیں محسوس کر رہے تھے

"ہم مخالف منڈل کمیشن گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تنظیم کے لیے روپیہ اکٹھا کر رہے ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ میں نے اپنا پرس کھولا اور سو روپے کا نوٹ ان کے ڈبے میں ڈال دیا لڑکوں نے شکریہ ادا کیا اور ہدایت کی کہ یہاں سے لونڈا (LONDA) اسٹیشن پار ہونے تک کھڑکیاں اندر سے بند رکھیں۔ پھر --- وہ سب دھپ دھپ کرتے نیچے کود گئے۔

لڑکے جا چکے، مگر ٹرین ہلتی نہ تھی۔ باہر شور شرابہ جاری تھا کچھ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ ہم نے سوچا کہ بم پھٹا۔ مگر نہیں .... سیٹی ہوئی اور گاڑی چل پڑی ہم نے ایک دوسرے کو چھو کر اطمینان کر لیا کہ زندہ ہیں۔

بڑی دیر بعد وہ آئی۔ بتانے لگی کہ وہ بم نہیں تھا۔ ایک زوردار پٹاخہ تھا جسے ہمارے بازو والے ڈبے میں سفر کرنے والی کرسنتان فیملی کو خوف زدہ کرنے کے لیے ان لڑکوں نے چھوڑا تھا، کیونکہ انہوں نے یہ کہتے ہوئے چندہ دینے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان کی 'بڑی' اور 'چھوٹی' ذاتوں کے بیچ کی لکیر ہیں۔ اور دونوں ہی مراعات انہیں پہلے ہی سے حاصل ہیں۔ لہٰذا وہ منڈل کمیشن سفارشات کی نہ ہی تائید میں ہیں اور نہ ہی مخالفت میں۔ اس نے بتایا کہ اس مرد کا نام جے۔ جے کرسٹوفر ہے۔ یعنی جنگم پلی جنتے رام کرسٹوفر۔

کرناٹک اسٹیٹ چھوڑنے کے تھوڑی دیر بعد تناتی گھاٹ سے گھاٹوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اٹھارہ گھاٹوں سے گاڑی گزرتی رہی۔ ریلوے لائن کی دونوں طرف اتنے خوبصورت مناظر تھے کہ بار بار خدا کی شان میں قصیدہ ہو جاتا۔ کرناٹک اسٹیٹ سے گوا تک کی ریلوے لائن پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ اس لیے اگر گھاٹ نہ بھی ہوں تو

گاڑی وادیوں سے گزرتی ہے۔ حدِ نظر تک مخملیں ٹیلے۔ . . . جن پر اڑتے ہوئے سفید ہنسوں کے سے پر پھیلاتے بادلوں کے دَل۔ بادلوں کو چیر کر۔ یا بادلوں کے اوپر سفر کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا احساس کچھ زیادہ ہونے لگتا تھا کیونکہ کہر سے کی وجہ سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہمارا ناطہ زمین سے ٹوٹ گیا ہے اور ہم آسمانی مخلوق میں شمار ہونے لگے ہیں۔

سونالیہ گھاٹ (SONALIA GHAT) کا معدنی پانی (MINERAL WATER) صحت کے لیے بے حد مفید سمجھا جاتا ہے۔ اکثر سیاح یہاں کا دو گھونٹ پانی پینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر شومیِ نصیب کہ یہاں گاڑی صرف دو ہی منٹ کے لیے رکتی ہے۔ میرے میاں نے شاید یہ بات پہلے ہی سن رکھی تھی۔ جوں ہی گاڑی رُکی، یہ صراحی لے کر نیچے کو دپڑے۔ ابھی صراحی بھری بھی نہ تھی کہ گاڑی کو کوچ کا اشارہ مل گیا۔ میری سانس اٹک گئی۔ مگر بچیوں نے یک زبان ہو کر وہ چُوں چُوں مچائی کہ ایک موصوف جو بہت دیر پہلے ہماری بوگی میں گھس آئے تھے ہنسنے لگے۔ موصوف کی سیاہ رنگت، موٹے موٹے ہونٹ اور آگے کو نکلی توند دیکھ کر میں نے اپنے تئیں یہ سمجھ لیا کہ غالباً یہی حلیہ گوا کا نمائندہ ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ حلیہ چاہے جیسا رہا ہو مگر گون دل کا بڑا بانکا ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر دروازے سے باہر سر نکال کر پتہ نہیں کیا اشارہ کیا کہ گاڑی پھسلنا بند ہو گئی۔ میرے میاں دوڑ کر اندر آ گئے۔ ہم سب نے مل کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ مگر میں . . . . اپنی حیرت چھپا نہ سکی کہ گاڑی نے موصوف کا اشارہ کیوں؟ اور کیسے سمجھا ۔؟ انہوں نے بتایا کہ وہ ریلوے سرکار میں (VIGILENCE OFFICER) ہیں اور اس علاقے کا سارا عملہ ان کا ماتحت ہے انہوں نے اپنا نام کمال شیخ بتایا تو میں دنگ رہ گئی کیونکہ موصوف چہرے مہرے سے مسلمان تو ہرگز نہیں لگتے تھے۔ میرا ایقان تھا کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سندھی، پارسی، گجراتی سب اپنی صورتوں ہی سے پہچانے جا سکتے ہیں، کیونکہ مذہب کی چِلا بتشر کے بشرے میں، آنکھوں کی پتلیوں اور رخساروں پر، پپوٹوں کے آس پاس، ہونٹوں کے دونوں طرف گالوں کی سمت بڑھتی لکیروں میں کہیں ضم ہوئی محسوس ہوتی ہے ___ کہ . . . . اگر انسان کو یک دم ننگا، یعنی قومیت اور ملّت کے واجبات سے یکسر خارج کر کے

آدم زاد کر دو۔۔۔ تو بھی۔۔۔ پلکوں کے اٹھنے گرنے ہی سے اس کی قومیت و ملت کا اندازہ ہو جائے گا۔ مگر۔۔۔ کبھی کبھی کچھ باتیں حقیقت ہوتی ہوئی بھی عام نظریئے سے انحراف کر جاتی ہیں۔ اسی طرح کمال شیخ صاحب کا حلیہ میرے نظریئے سے اختلاف کر گیا۔

یوں تو ہم نے واسکو تک کا ٹکٹ ریزرو کیا تھا۔ مگر کمال شیخ صاحب کے مشورے پر مڑگاؤں (MARGOAN) پر، جو پرانے گوا کا ہیڈ کوارٹر ہے، اترنے کا فیصلہ کیا۔ کمال شیخ صاحب کی مدد سے صرف پانچ منٹ کے اندر اندر اسٹیشن کے بالکل مقابل گرین ویو (GREEN VIEW) ہوٹل کے نہایت کشادہ اور آرام دہ کمرے میں پہنچ گئے۔

گوا کا موسم (TROPICAL) ہوتا ہے۔ لہٰذا ہماری طرح یہاں بھی جون سے ستمبر کے درمیان بارش ہوتی ہے جب ہم مڑگاؤں اسٹیشن پر اترے تو معمولی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں زوردار بارش ہوئی۔ کچھ دیر بعد جب بادل چھٹ گئے تو ہم باہر نکلے اور رات گیارہ بجے تک سڑکوں پر یوں ہی گھومتے رہے۔

حیدرآباد سے (۷۵) کلومیٹر دور یہ شہر اپنے آپ میں بڑا پرانا محسوس ہوا۔ وقفے وقفے سے بارش ہونے کی وجہ زمین ویسی ہی لسلسی ہو گئی تھی جیسی حیدرآباد کے پرانے شہر کی۔ ویسی ہی گنجان آبادی، ہوٹلیں، دکانیں۔ مگر اس وقت دکانیں ساری بند تھیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں دکانیں سختی سے سات بجے بند کر دی جاتی ہیں۔

گوا اپنی طرز کا واحد ملک ہے جہاں کسی چیز پر امتناع عاید نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں رات کا منظر ہم حیدرآبادیوں کے لیے بڑا تعجب خیز ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں شام کے دھندلکے کے ساتھ ہی قدم قدم پر شراب کی دکانیں اور بار کھل جاتے ہیں۔ یہاں شراب کی دکانیں ہمارے یہاں کے پان کے ڈبوں کی طرح جگہ جگہ ڈھالیوں میں لگی ہوتی ہیں۔ دیسی شراب (COCO NUT PHEENY) اور (CASHEW PHENNY) کاجو اور ناریل کی شراب لوگ آئسکریم کے گلاسوں کی طرح پلاسٹک کے گلاسوں میں سڑکوں پر کھڑے پیتے ہیں۔ انہیں آزادانہ اس طرح پیتے دیکھ کر مجھے حضرت غالب بڑے یاد آئے کہ انہوں نے ادھر آنے کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ ہو سکتا ہے پر تنگالی

عملداری کی وجہ سے ان کی ہندوستانی ناعائل ہوگئی ہو۔ بہرکیف اچھا ہوا ورنہ
عمر مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے

والا شعر اُن سے سرزد نہ ہوتا۔!

چونکہ رات کا وقت تھا اس لیے سڑکوں پر صرف مرد ہی مرد نظر آتے تھے۔ اب مردوں کے رہن سہن سے کسی شہر کی تہذیب کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔!! وہی پتلون قمیص، وہی نرنجی مانگ۔ تہذیب کے حقیقی امین تو عورتیں ہوتی ہیں جن کے منھ میں زبان نہ بھی ہو تو ان کے پہناوے اُن کی تہذیب کی چغلی کھاتے ہیں۔

بحیرہ عرب کے کنارے (۲۰۲ ×۳) کلو میٹر طول وعرض میں پھیلی یہ کالونی (۴۵۱) سال تک پرتگالیوں کے قبضے میں رہ کر ۱۷ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو آزاد ہوئی، اور دمن اور دیو (DAMAN & DEU) کے ساتھ یونین ٹیریٹریز میں شامل کرلی گئی۔ ۳۰ر مئی ۱۹۸۷ء کو اسے آزاد ہندوستان کی پچیسویں ریاست تسلیم کیا گیا۔ گوا کا پایۂ تخت پناجی (PANAJI) ہے۔ یہ ریاست صرف دو اضلاع پر مشتمل ہے۔ شمالی اور جنوبی گوا۔ شمالی گوا کا ہیڈ کوارٹر پناجی ہے اور جنوبی گوا کا مڑ گاؤں، جہاں پرانی پرتگالی تہذیب کی باقیات اب بھی موجود ہیں۔

منڈوی ندی (MANDAVI RIVER) پر بسا شہر پناجی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ گوا کا نو آباد شہر ہے۔ تمام سرکاری دفاتر اور سکریٹریٹ یہیں واقع ہیں منڈوی ندی کا ساحل جہاں ایک طرف تو اونچی اونچی عصری طرز کی عمارتیں سر اُٹھائے کھڑی ہیں۔ وہیں دوسری طرف اس کے کشادہ سینے پر پھسلتی فریز (FERRIES) ہمیں صدیوں پیچھے خوابوں کی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ ساحل، لندن کی بندرگاہ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

اس ندی کے دوسرے کنارے پر ماپوسا (MAPUSA) شہر آباد ہے جہاں پہنچنے کے لیے لوگ صبح کے اوقات اپنی اسکوٹر، موٹر اور مال واسباب سمیت فریز میں سوار ہو جاتے ہیں۔ یہ فریز حکومت کی طرف سے چلائی جاتی ہیں۔ اس میں سفر کرنے کے لیے لوگوں کو کوئی معاوضہ ادا کرنا نہیں ہوتا۔ دراصل یہ ایک طرح کی آبی راہ داری ہے۔ ویسے منڈوی ندی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک پل

تعمیر کیا جارہا ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد پرتگالیوں کی رہی سہی یادیں بھی اس ندی کے آنچل سے مٹ جائیں گی۔

جس طرح فیروز آباد کے اسٹیشن پر انزونو بیر میں کانچ کا چبھنا ناگزیر سمجھا جاتا ہے، اُسی طرح گوا کے اسٹیشن پر انزونو ناک پر دستی رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ ماہی گیری یہاں کا اہم پیشہ ہے۔ سڑک پر یہاں وہاں مچھلیاں پڑی دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں کبھی کبھی مُوز کے چھلکے دکھائی دیتے ہیں۔

مچھلی گوا کے باشندوں کی مرغوب غذا ہے۔ اس لیے ہوٹلوں میں جس طرح یہاں چاول کے ساتھ دال ضروری سمجھی جاتی ہے، اسی طرح وہاں مچھلی کا سالن، جو دیکھنے میں حیدرآبادی کڑھی کی طرح ہوتا ہے۔ ہاں مگر مزہ جُدا ہوتا ہے۔ دراصل یہ سالن، ہماری حیدرآبادی کڑھی اور ماہی فلیٹ کی درمیانی شکل کا نام ہے۔

گوا گھومنے کے لیے ہم نے وہاں کے محکمۂ سیاحت کی خدمات حاصل کیں کیونکہ اس میں کفایت بھی تھی اور باقاعدگی بھی۔ سٹی ٹور (CITY TOUR) کی بسیں پناجی شہر کی ٹورسٹ ہوٹل، سے نکلتی ہیں جو منڈوی ندی کے ساحل پر آباد ہے

LADIES AND GENTLEMEN! NOW WE ARE PASSING BY THE BANK OF RIVER MANDAVI –

جی ہاں! یہاں گائیڈ صرف انگریزی بولتے ہیں۔ اگرچہ کہ کونکنی یہاں کی علاقائی زبان ہے یہاں چھوٹے بڑے سب انگریزی اتنے ہی فراٹے سے بول لیتے ہیں جتنے حیدرآباد کے غیر اردو داں حضرات اردو بول لیتے ہیں۔ "یہ ڈونا پاؤلا بیچ ہے"، گائیڈ نے کہنا شروع کیا۔ بحیرۂ عرب کے کنارے پناجی شہر سے صرف (۷) کلومیٹر دور، پرتگالی طرز کا یہ خوبصورت ساحل ہے۔ یہاں ایک خوبصورت پرتگالی مجسمہ نصب ہے، جس کے نیچے ایک بڑی پرتگالی عبارت نقش کی ہوئی ہے۔ یہی نہیں اب بھی جگہ جگہ پارکس، ریستوران اور بازاروں میں پرتگالی زبان میں تختیاں اور تحریریں دکھائی دیتی ہیں۔

ڈونا پاؤلا بیچ پر ایک حسین منظر گاہ یعنی (VIEW POINT) بنی ہوئی ہے

---

* عربی لفظ ہے۔ کیلے کو دکن میں موز کہتے ہیں۔

جہاں سے مرما گاؤں ہاربر (MARMA GAON HARBOUR) زاوری ندی کا دہانہ، گورنر کا محل اور پرانا اگواڈا قلعہ (AGUADA FORT) دیکھا جا سکتا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ نوجوان لڑکے ہاتھوں میں دوربین لئے گھومتے رہتے ہیں، اور فی کس ایک روپیہ کے عوض سارے اہم مقامات دکھاتے ہیں۔

"یہ گورنر کا محل ہے۔ گورنر خورشید عالم صاحب آج کل یہیں رہتے ہیں" دوربین سے ایک طرف اشارہ کر کے لڑکے نے کہا تو مجھے گورنر خورشید عالم کی قسمت پر رشک آنے لگا۔

"پھر تو یہاں رہ کر وہ بڑا بے دین ہو گیا ہوگا۔ لب ساحل بنے اس عشرت کدے میں رہ کر اس کے دل سے جنت کی لالچ ہی مٹ گئی ہوگی۔"

وہ اچانک بیچ میں ٹپک پڑی۔

HEY ! COULD YOU HEAR ME ?

WHO STANDS THERE ?

یہ مقام سنیما والوں (CINE FIELD) والوں کے لیے ہمیشہ توجہ کا مرکز رہا ہے بمبئی تھیٹر کی مشہور فلم "اک دوجے کے لیے" یہیں فلمائی گئی تھی۔"

یہ گائیڈ تھا جو موقع بے موقع مسلسل کچھ نہ کچھ کہنا اپنے فرائض منصبی کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔

پناجی شہر سے صرف (۳) کلومیٹر دور میرامار بیچ (MIRAMAR BEACH) واقع ہے۔ اسے "گوا کا سنہرا ساحل" (GOLDEN BEACH OF GOA) کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا پارک (PARK) بنا ہے، جس کے وسط میں ایک پہاڑ نما مچھلی نصب ہے۔ بچے مچھلی کے منہ میں سے داخل ہو کر دُم میں سے نکلتے ہوئے یوں کلکاریاں مارتے ہیں کہ گویا مچھلی کے پیٹ میں بیٹھے وہ سارا بحرۂ عرب گھوم کر آرہے ہوں۔ یہ ساحل ماہی گیری کے لیے نہایت موزوں ہے۔ یہاں کثرت سے شکاری کشتیاں ڈولتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں کی سنہری ریت اس قدر سنہری ہے کہ سونے کے برادے کا گمان ہوتا ہے۔

"سینٹ زیویئرز چرچ (ST XEVIER'S CHURCH) پرانے گوا کی سب سے پرانی عمارت ہے۔ یہ عمارت پرتگالی فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس عمارت کا سب سے

متاثر کن حصہ اس کا بلند و بالا، صدر دروازہ ہے۔ جسے اوپر تک دیکھنے کے لیے ٹوپی اتارنی پڑتی ہے۔ . . . ،،

،، یہ سینٹ زیویئیر کی تین سو سال پرانی لاش ہے۔ ہر سال ۳ دسمبر کو یہاں ایک FEAST یعنی جشن منایا جاتا ہے اور ہر دسویں سال مقدس راہب کی لاش زیارت کے لیے نیچے اُتاری جاتی ہے۔

،، میڈم! کیا آپ دیکھ سکتی ہیں۔ . . ؟،،

گائیڈ نے مجھے ذہنی طور پر موجود نہ پاکر پوچھا۔ دراصل بڑی دیر سے میں اپنے آس پاس ،، اسی ،، کو تلاش کر رہی تھی۔ مجھے فکر لاحق ہوگئی تھی کہ کہیں وہ میرا ماربیچ ،، پر مچھلی مارکٹنیوں پر ادھر ادھر بھٹکتی تو نہیں پھر رہی ہوگی ۔ !

،، میڈم! آپ بھی آگے آجائیں ،، مجھے سب سے پیچھے دیکھ کر گائیڈ نے بلایا۔ مگر جوں ہی میری نظر ممبر کے اوپر تابوت پر پڑی میں دنگ رہ گئی۔ کیونکہ ،، وہ ،، وہاں موجود تھی۔

،، تم وہاں سے راہب زیویئیر کا صرف چکنا سر ہی دیکھ سکتی ہو۔ یہاں سے دیکھو۔ واقعی یہ راہب اپنے زمانے میں کافی اسمارٹ رہا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ آپ ہی آپ سکڑ کر ایک فٹ گھٹ گیا ہے۔

،، پتہ نہیں عزت افزائی کی یہ کون سی تہذیب ہے کہ اچھی خاصی خوبصورت ۔ یاد کو بالشت بالشت گ۔ اکر مسخ کر دو ۔ !،، اس نے ایک مسخر آمیز قہقہہ لگایا اور نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سی کیتھیڈرل (SEA CATHEDRAL) گوا کا بلکہ دنیا کے بڑے کلیساؤں میں سے ایک ہے۔ اس میں پانچ بڑے گھنٹے لگے ہوئے ہیں جن میں سے ایک دنیا کا مشہور سنہرا گھنٹا (THE FAMOUS GOLDEN BELL) مانا جاتا ہے۔ یہ رومن کیتھولک چرچ ہے۔ یہاں راہبوں کے بتوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ یہاں (۱۲) قربان گاہیں (ALTARS) بنی ہوئی ہیں۔ یہ کیتھیڈرل راہبہ کیتھرین (ST CATHERENE) کے نام سے منسوب ہے۔ ان (۱۲) قربان گاہوں میں سے ایک قربان گاہ پر سینٹ کرسٹوفر کا بت نصب ہے۔ جس کے نیچے ایک کراماتی صلیب رکھی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس صلیب کے نیچے سے گزر جائیں تو دلی مراد پوری ہو جاتی ہے۔

یوں تو گوا میں کلیساؤں کی بھرمار

ہے مگر ٹور ہزم والے 'سی کیتھیڈرل'، 'بام جیزز' اور 'سینٹ زیویئرز چرچ' ہی کو اپنے پروگرام میں شامل رکھتے ہیں۔ اس لیے دوسرے کلیساؤں کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا

ہماری آگے والی منزل منگیشی مندر تھا۔ گائیڈ نے بتایا کہ ہندوستان کی مشہور پلے بیک سنگر لتا منگیشکر یہیں پیدا ہوئیں۔ اور یہ کہ لتا جی نے ابتدائی سنگیت کی تعلیم اسی مندر میں بھجن گانے سے شروع کی تھی۔

چھوٹی سی پہاڑی پر بنا یہ مندر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ گوا کی بستیاں اور عمارتیں اونچے نیچے ٹیلوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ اس لیے عمارتیں ایک سطح پر منظم نہیں دکھائی دیتیں۔ بلکہ بے ترتیب اونچی نیچی معلوم ہوتی ہیں۔ اسی بے ترتیبی کی وجہ سے کہیں کہیں ہل اسٹیشن کا گماں ہوتا ہے۔ زمین پتھریلی ہونے کے باوجود اس قدر زرخیز ہے کہ اندر کی لال لال زمین دیکھنے کے لیے اوپر سے گھاس کی تہہ اکھاڑنی پڑتی ہے۔ یہاں کی چٹانیں بھی عام چٹانوں سے مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ دور سے دیکھو تو لگتا ہے کہ ہاتھ میں لیکر مل دو تو چٹان کنکری کنکری نیچے گر جائے گی۔ مگر نہیں .... اتنی سخت جان ہوتی ہیں کہ ریلوے حکام نے پٹریوں کی دونوں جانب کم از کم ایک فٹ گنجائش بھی نہیں چھوڑی کہیں کہیں تو بس ریل کی پٹری ہی کے برابر چٹانیں تراشی گئی ہیں۔

انسان، گلی کوچوں میں چاہے جیسے رہا ہو، مگر عبادت گاہوں میں وہ اپنے اوپر چڑھی تہذیب کی مصنوعی عبا اتار پھینکتا ہے، اور لاشعوری طور پر اپنے آپ کو پرت

در پرت اپنے معبود کے حضور پھیلا دیتا ہے۔ منگیشی مندر جس میں بھگوان شیوا کی پوجا کی جاتی ہے، لوگوں کی عقیدت میرے اس خیال کی تصدیق کرتی ہے، ہر آدمی اپنے آپ میں کتنا گمبھیر اور وزنی لگتا تھا اُس قطار میں کھڑا ہوا — ایک دم کھرا اور سچا — !

یہ انسان بھی بڑا عجیب جیوان ہے — ! خود ہی مٹی گارے سے عمارت تعمیر کرتا ہے خود ہی اپنے ہاتھوں پتھر سے بُت تراشتا ہے . . . . اور . . . اپنی روح کے اندر چھپے جذبۂ ایماں کو باہر کھینچ نکالتا ہے اور اُس بے جان میں سمو دیتا ہے — تب کہیں جاکر اُسے خدا کی مورت سے منسوب کرتا ہے۔ پھر زندگی . . . کی مصروف ترین دوڑ سے دو چار لمحے نکال کر . . . اپنے پاؤں چل کر . . . اُس بُت کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔ کاش — ! اتنا کچھ کرنے کی بجائے انسان اپنے اندر موجود ان جذبوں کو باہر ہی نہ نکالتا اور بجائے پتھروں کی عمارتوں میں قید کرنے کے انہیں اپنی روح کی پنڈشوں میں محصور رہنے دیتا — !! اُس وقت بھی انسان اپنے آپ میں کتنا گمبھیر . . . وزنی . . کھرا، اور سچا ہوتا — !!!

مندر کے دامن میں بے شمار پھول بیچنے والیاں، بانس کی ٹوکریوں میں بیلا کے پھول لیے بڑا دلفریب منظر پیش کرتی ہیں ان پھول بیچنے والیوں میں زیادہ تعداد مراٹھی عورتوں کی ہوتی ہے۔ یہاں کثرت سے بیلا کے پھول چڑھائے جاتے ہیں، جنہیں رنگین سیوتی اور سبزے سے ملا کر بڑے خوبصورت انداز میں گوندھا جاتا ہے۔ ڈھائی، پانچ دس اور پندرہ روپے کے ہار بنے ملتے ہیں، جنہیں یہ عورتیں خوبصورت سی ننھی ننھی بانس کی ٹوکریوں میں یا پھر دونے میں لپیٹ کر دیتی ہیں۔ یہ منظر بڑا دل آویز ہوتا ہے۔ میں نے بیلے کے پھول پہلی بار دیکھے تھے۔ سفید موٹی موٹی پتیوں والے اُن ہنستے ہنستے بشاش پھولوں کے لمس سے جو کیف اس وقت مجھ پر طاری ہوا تھا، وہ آج بھی باقی ہے۔

”لگا نا نئیں — ان کو جوڑے میں لگا نا نئیں۔ یہ تو بھگوان کے چرنوں میں ہی شوبھا دیتا منگتا“

میں بڑی خجل ہوئی۔ پتا نہیں کیسے تاثرات ابھر آئے تھے میرے چہرے پر اس وقت ابھی میں سر اٹھا کر اُس پھول والی کی طرف دیکھا ہی چاہتی تھی کہ بازو سے ”اُس“ کے کھکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی میری ندامت پر وہ بڑی خوش ہوا کرتی تھی۔ ”دیکھا، چہرہ

کتنی کھلی کتاب ہوتا ہے۔ اس کو پڑھنے کے لیے واسطوں کی ضرورت نہیں ہوتی ... کسی حد تک میں اس کی بات سے متفق تو تھی، مگر بکسر نہیں، میرا ایقان ہے کہ چہرہ کھلی کتاب تو ضرور ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی اس سے کچھ پتے ایک دوسرے سے یوں چپک جاتے ہیں کہ انہیں الگ کرنے کے لیے کسی نہ کسی واسطے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسا واسطہ جس کے ہر لمس سے ایک ایک جھری کو زبان مل جائے۔

سنکری گاؤں میں سپاری کے درختوں میں گھرا، ایک صدی پرانا شری دتہ مندر ہندوستانی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ مندر کے سامنے صحن میں ایک بہت بڑا گول پویلین بنا ہوا ہے، جن پر مختلف جانوروں کے مجسمے نصب ہیں، اور اندر بھگوان برہما، وشنو اور مہیشور کے بت پوجے جاتے ہیں۔ یہاں بے حساب سکھ عقیدت مندوں کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا، کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ سکھ وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں، اور خدا کی ذات میں کسی کو شامل نہیں کرتے۔ گائیڈ نے بتایا کہ اس مندر سے یہ روایت جڑی ہوئی ہے کہ یہاں دماغی بیماریوں کا غیبی علاج ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہندو فرقے کے علاوہ اور بھی لوگ یہاں اس غرض سے آتے ہیں۔

گوا میں مندروں کی بھی بہتات ہے۔ یہاں کی آبادی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق دس لاکھ ہے، جن میں ۴۵ فیصد ہندو ہیں۔ ما باقی ۵۵ فیصد میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ تیسری بڑی جماعت مسلمانوں کی ہے۔ ویسے یہاں ہر علاقے اور مذہب کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ تہذیب پر عیسائی چھاپ اتنی زیادہ ہے کہ پہناوے سے ذات پات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہندو آبادی میں مرہٹوں کا غلبہ محسوس ہوتا ہے۔

گوا کی علاقائی زبان کونکنی ہے مگر یہ زبان صرف ساحلی علاقے کے ماہی گیر قبیلے میں زندہ رہ گئی ہے۔ پرانی کونکنی تہذیب کو اسی قبیلے نے سنبھال کے رکھا ہے۔ چکنی چکنی مچھیرنوں کو دیکھ کر دل میں ایک عجیب، بے ہنگم سا احساس ہوتا ہے۔ کچھ ناگوار، کچھ خوشگوار، ہو سکتا ہے۔ میں جس احساس کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں اس کا مجھ سے زیادہ میرے شوہر صاف طور پر اظہار کر سکیں۔

سڈول کسا ہوا جسم، چکنی گہری سانولی رنگت، اونچے رخسار اور بڑا دہانہ، کاجل لپی بڑی بڑی آنکھیں، کانوں میں ایک ایک انچ نصف قطر والی بڑی بڑی سونے کی، یا

سنہری بالیاں، بالوں کو سمیٹ کر سر سے اوپر گول جوڑا، ساری لنگوٹ کی شکل میں اڑسی ہوتی۔ یا پھر — کھلی بھی ہو سکتی ہے۔ مگر قسم لے لو جو ذرا گھٹنوں سے نیچے اتری ہو۔ اور سینے پر پلو تدارد — بلاؤز نہایت مختصر، بس اتنا ہی جتنی ضرورت ہو۔ پتا نہیں، کونکی عورتیں پلو کیوں نہیں نکالتیں —! یا پھر ان کی تہذیب میں اس کی ضرورت ابھری ہی نہیں کہ عورت ہو تو عورت پن کا احساس باقی رہے۔ شکاری کشتیوں میں ہوں کھار کھیت میں مچھلی بیچ رہی ہوں، کونکی عورتیں واقعی بڑی صاف ستھری، نکھری، دُھلی، کچھ تو معطر بھی خوشبو سے معطر ہوتی ہیں... نظر بھر کے دیکھو تو کیف چھا جاتا ہے — مگر... جب بولنے لگیں،... تو لگے گا کہ دیسی شراب کی ریکل چلا رہے تھے کہ جھٹک کر گرا دیئے گئے اور سات طبق زمین میں دھنسا دیئے گئے۔

میں نے سوچا کہ اگر ان کے منہ میں زبان نہ ہوتی، تو یہ عورتیں سنگِ سیاہ کی بہترین مورتیاں معلوم ہوتیں۔ ان کی مادری زبان کونکنی ہوتی ہے مگر ہم جیسے غیر زبان لوگوں سے یہ انگریزی میں ایسے ہی بول لیتی ہیں جیسے میں نے پہلے ہی کہہ دیا۔

محکمۂ سیاحت کے حکام شمالی اور جنوبی گوا کے علاحدہ علاحدہ پروگرام منتخب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سارے مندر، کلیسا اور تمام ساحل تسلسل سے نہیں دکھاتے صرف سمت کا تعین کرتے ہیں اور متعینہ راستے میں جو بھی مقام قابلِ دید ملے دکھا دیئے جاتے ہیں۔

کولوا بیچ (COLVA BEACH) پر لہریں بڑی سرکش ہوتی ہیں۔ لہروں کے تھپیڑوں سے ساحل پر دس گز دور کھڑا آدمی بھی قدِ آدم بھیگ سکتا ہے۔ سچ —! سمندر کے کنارے زندگی کتنی سمٹ جاتی ہے اور وقت کتنا تنگ ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ تو اسے جھیل کر ہی ہوتا ہے —!!

میں نے اپنے آپ کا تجزیہ کرنے کے لیے اپنا سر جھکایا، اور آنکھیں میچی ہی تھیں کہ گریبان سے سر نکال کر ٹمٹماتی آنکھوں سے اُس نے پوچھا،... کیا تمہیں ایسا نہیں لگ رہا ہے کہ کاش ہمارے پاؤں زمین کی بجائے سمندر کی لہروں پر ٹکے ہوتے۔ اور ہم — دور تک سمندر کے سینے پر ڈولتے رہتے۔ سورج کی سنہری کرنیں ہمارے کس بل سدھارتیں — چاندنی میں لپٹی، روپہلی لہریں لوریاں سناتیں۔ لڑکھڑاتے

قدموں سے جب اپنا ہی بوجھ سنبھالے نہ بنتا، تو زمیوں پر ہونے والے استقامت اور سالمیت کے جھمیلوں سے دور ــ اس خون خرابے سے تو پاک رہتے ــ !! "کبھی کبھی اس اوبڑ کھابڑ لڑکی کی زبان دانشوری کے تابڑ توڑ حملے کرتی ہے۔

کلنگوٹ بیچ (CALANGUTE BEACH) تک پہنچتے پہنچتے لہر .بن سنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ یہاں ساحل پر دور دور تک بڑے بڑے گنڈ[1] سر نیوڑائے کھڑے ہیں، جن کے گنجے سروں پر چیل کوے کی طرح بیٹھے سیاح شام کے دھندلکے میں بڑے پر اسرار لگتے ہیں۔

گوا در اصل ساحلوں کی سرزمین ہے۔ اور کلنگوٹ بیچ کو ساحلوں کی رانی (QUEEN OF BEACHES) کہا جاتا ہے۔ یہاں کی تفریح گاہ (HOLIDAY RESORT) غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ ساحل پر دور تک جھونپڑے بنے ہیں۔ نرم ملائم ریت پر ادھر ادھر ننگے غیر ملکی سیاحوں کو لیٹا ہوا دیکھ کر دل میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ انہیں اب بھی اس مٹی سے کتنا پیار ہے۔ ۔!

"NUDISM PROHIBITED" گائیڈ نے ایک تختی کی طرف اشارہ کیا۔ گوا میں جہاں کسی چیز پر امتناع نہیں ہے وہاں برہنگی پر ہی کیوں ــ ! یہ خیال اب میرے ذہن میں آیا ہی تھا کہ گائیڈ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ انجونا بیچ (ANJUNA BEACH) ہے۔ اسے ہپیوں کی جنت (HIPPIES PARADISE) بھی کہا جاتا ہے۔ کچھ سال قبل مغرب میں جب ہپی ازم کی لہر چل پڑی تو کئی غیر ملکی ہپیز ادھر ہی آبسے۔"

کیا خاص بات ہو سکتی ہے ! ریت البتہ سونے میں نہلا کے آئی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سوچا اور جلدی جلدی اپنے جوتے اتارے اور ننگے پاؤں جلتی ہوئی لوہے کے جنگلے کے کنارے کنارے ساحل کی طرف اندر بڑھنے لگے۔

"آپ اُدھر نہیں جا سکتیں۔" گائیڈ نے تنبیہ کی۔

" ننگے سیاحوں کے ساتھ عام آدمی کے لیے بھی ادھر داخلہ منع ہے۔

---

[1] دکن میں گول گول بڑی بڑی چٹانوں کو کہتے ہیں۔

(NUDITY IS BANNED) گائیڈ نے اکڑ کر کہا تو مجھے بڑا تاؤ آیا۔ میں نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پاس ہی کھڑی وہ پھلجھڑی کھِیں کھِیں کرنے لگی۔ اس کی اِس بے موقع مداخلت پر میں جز بز ہوگئی، اور تائید کرنے کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا اس نے ایک سمت کو اشارہ کیا جہاں کئی ننگے اجسام کیچوؤں کی طرح پڑے تھے۔

" NUDITY اِدھر تو منع نہیں۔" اُس نے کہا اور اچھلتی کودتی لہروں میں غائب ہوگئی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے گائیڈ کی طرف دیکھا، تو گائیڈ جھینپ گیا۔ "اب ہماری آگے والی منزل مرما گاؤں ہاربر (MARMAGAON HARBOUR) ہے۔"

(HE IS A VERY SMART MAN) میں نے دل میں سوچا۔

مرما گاؤں ہاربر، ہندوستان کے مغربی ساحل پر ایک قدرتی بندرگاہ ہے۔ یہ ہندوستان کی دوسری بڑی کوسٹل لائن ہے۔ یہ بندرگاہ واسکو۔ ڈ۔ گاما شہر سے صرف (۴) کلومیٹر دور واقع ہے۔ بیرونی تاجر یہاں مختلف اشیاء بیچتے نظر آتے ہیں، اور ساتھ ہی دیسی تاجر، دیسی مال پر بدیسی لیبل لگا کر سیاحوں کی جیب ہلکی کرتے ہیں۔

یہ بندرگاہ ایک طرح سے بحری فوجی چوکی ہے۔ اس لیے وقت واحد میں تین چار بڑے بڑے جہاز ساحل پر ٹھہرے ہوتے ہیں اور بحری فوجی افسر اِدھر اُدھر پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ بندرگاہ کے اندر داخلہ منع ہے۔ ہاں مگر اونچائی پر ایک RESORT بنا ہے۔ سیاح بس وہیں تک جا سکتے ہیں۔

گوا کی دو بڑی اور اہم صنعتیں ہیں۔ ایک تو مچھلی برآمد کرنا اور دوسری خام لوہا نکالنا۔ یہاں بڑی مقدار میں لوہے کی کچ دھات دستیاب ہوتی ہے۔ منڈو نام کا ایک تاجر یہاں کے ایک لوہے کی کان کا مالک ہے۔ گائیڈ نے بتایا کہ بمبئی ٹھنڈر کی فلم "کبھی کبھی" کی فلم بندی اسی کان میں ہوئی۔

بیرونی طور پر گوا، ایک طرف مارما گاؤں ہاربر کی وجہ پانی کے راستے دنیا سے جڑا ہے، تو دوسری طرف ڈوبلن ایرپورٹ (DOUBLING AIRPORT) ہوائی راستوں سے اسے دنیا کا سمبندھی بناتا ہے، اور اندر کی طرف بے شمار ندیاں،

تیراکول (TIRACOL)، چاپور (CHAPORA)، منڈوی (MANDVI)، زاوری (ZAVRI)، سال (SAL)، تال پونا (TAL PONA)

اور نہروں:

مائم (MAEM) اور کیارم بولم (CARAM BOLIM) کی موجودگی سے اس کے سینے پر آبی راستوں کا جال سا بن گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ساری ندیاں کشتی رانی کے لیے موزوں ہیں۔

دودھ ساگر واٹر فال (DUDH SAGAR WATER FALL) ایک ایسا آبشار ہے جو دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ دارالخلافہ سے (۶۰) کلومیٹر دور، ریلوے لائن سے جڑا، مڑگاؤں سے واسکو جاتے ہوئے کولم (COLEM) ریلوے اسٹیشن سے (۱۰) کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ گو کہ یہاں کوئی باقاعدہ اسٹیشن نہیں ہے۔ پھر بھی ریلوے حکام کی ہدایت پر چند منٹ کے لیے ریل گاڑی یہاں رکتی ہے۔ سیاح تو اترتے ہی ہیں، مگر مسافر، جنہیں اترنا نہیں ہوتا۔ ان کی خوشی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا بچے — کیا بوڑھے، ٹرین کے رکتے ہی سب دھڑا دھڑ نیچے کود جاتے ہیں۔

سینکڑوں فٹ کی بلندی سے گرتا ہوا، یہ آبشار دودھ کا سا سفید تو ہوتا ہی ہے مگر، اپنے اطراف میل ڈیڑھ میل کی دوری تک سورج کی سنہری کرنوں کی زد پر ایک زرّیں ہالہ تعمیر کر لیتا ہے۔ سنہری ہالے کے بیچ سے گرتا ہوا دودھ سا سفید آبشار ہزاروں سال پرانی اساطیری کہانیوں کی جل پری معلوم ہوتا ہے۔ جس کے دونوں پروں پر آفاقی ہیولے اور پیروں میں گھنگرو بندھے ہوتے ہیں۔ فضا میں دور تک اس کے آنچل کی سرسراہٹ دھیمے سروں میں ایک مدہوش کن راگ باندھ لیتی ہے۔

نیچے پہنچتے پہنچتے جہاں آبشار ٹھہر کی صورت سکوت اختیار کر لیتا ہے بے حساب سیاح پانی میں چت پڑے ہوتے ہیں۔

دودھ کے سائبان تلے جھل جھل بہتے پانی کے بچھونے پر لیٹے ہوں، اور سورج کی سنہری کرنیں احساس کو گدگدا رہی ہوں، تو زندگی کے کتنے ہی اسرار از خود کھل جاتے ہیں — یہ میں نے پہلی بار محسوس کیا۔

گائیڈ نے بتایا کہ یہاں نیشنل (WILD LIFE SANCTURIES) بھی ہیں
بانڈلا (BONDLA) کوٹی گاؤں (COTI GAON) اور مولم (MOLEM) میں
مگر ــــ "ایک بار جو کسی نے حیدرآباد کے "نہرو زوالوجیکل پارک کی WILD LIFE
دیکھ لی ہو تو اسے یہاں وہاں دیکھنے کے لیے کیا رہ جاتا ہے ــــ" گائیڈ نے کہا تو
میں نے جھک کر اپنے جامے کی گنجائش کا جائزہ لیا۔

کمال شیخ صاحب نے ہم کو کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ چلو اس بہانے یہاں کی
تہذیب سے باضابطہ "معانقہ" ہو جائے گا، ہم نے سوچا۔

"آداب عرض ہے ..." ہاتھ اٹھا کر سلام کرتی ہوئی مسز کمال شیخ نے ہمیں دروازے
پر ہی "اپنے پن" کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اپنا نام "وسگیرہ" بتایا تو میں نے اپنے دل میں
اُسے "صغیرہ" تسلیم کرلیا۔

مسز شیخ ہماری ہی طرح ساڑی بلاؤز پہنی ہوئی تھیں۔ ہاں مگر بالوں کو خاص گوؤن
انداز سے اوپر اٹھا کر جوڑا سا بنا لیا تھا۔ اونچے رخسار اور بڑا دہانہ شاید گوا کی پیدائش کا
خاصہ ہے۔ پھر بھی اس صفت کو عمومی تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ کچھ لوگ گوؤن ہونے
کے باوجود سانولے اور پیارے تھے۔

کمال شیخ صاحب کا خاندان خاصہ (INDIANISED) تھا۔ وہی میبل
کرسی، وہی پکوان۔ یہاں ہمیں کوئی گوؤن ڈِش نصیب نہیں ہوئی۔ پھر بھی مرغ کا قورمہ
حیدرآبادی رنگ پیدا نہ کر سکا۔

اس دن کمال شیخ صاحب کے مکان پر ان کے چھوٹے چچازاد بھائی قادر شیخ
صاحب آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے دوسرے دن ہمیں کھانے پر بلایا۔

قادر شیخ صاحب کا مکان، واسکو، میں مارما گاؤں بندرگاہ کو آنکھیں دکھاتا۔
پہاڑی سلسلے پر، ناریل اور سپاری کے درختوں کے بیچ، ہل اسٹیشن پر کسی کاٹیج کی طرح
تھا۔ قادر شیخ صاحب کے والد والدہ، بھائی بھاوج، مسز قادر شیخ اور بچے سب ہی
خلوص کے پتلے تھے۔ ان کی والدہ کو ساڑی پر کرتا پہنے دیکھ کر مجھے اپنی اماں یاد آگئیں۔

یہاں جو ضیافت ہوئی، شاید وہ گوؤن تہذیب کی متقاضی تھی۔ ہمارے پہنچتے
ہی قادر شیخ صاحب کا وہ گلاس بھر بھر کے ناریل کا ٹھنڈا پانی پلانا ــــ چینی کی بڑی

اُجلی اُجلی رکابیوں میں ناریل ملائی کھلاتا ــ اور مسز قادر شیخ یعنی عائشہ بی بی کے ہاتھوں
بنا وہ لذیذ مچھلی کا سالن۔ تلی ہوئی مچھلی، موٹے چاول کا خشکہ (یہاں صرف موٹے
چاول ہی پیدا ہوتے ہیں، اور چاول گوؤن کی مرغوب غذا ہے) ساتھ میں ناریل کی
مٹھائی جو کیک کی طرح بیک (BAKE) کی ہوئی تھی۔ پھر چائے اور پان پیش
کرنا ہمیشہ یاد رہے گا۔

کمال شیخ صاحب کے مکان پر باتوں باتوں میں مَیں نے پوچھا کہ ــ "اب جبکہ وہ
پرتگالی چنگل سے آزاد ہیں کیا محسوس کرتے ہیں۔؟"

کمال شیخ صاحب ایک لمحہ سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے ــ "آزادی کسے پیاری
نہیں ہوتی ــ مگر جو تحفظ پرتگالی عملداری میں نصیب تھا، اب نہیں ہے۔ اگرچہ کہ قانون
وہی نافذ ہے۔ پھر بھی ــ آف دی ریکارڈ (OFF THE RECORD) کچھ بدل
ضرور گیا ہے۔ باوجود اس کے۔ ۔ ۔ ۔ ۔" انہوں نے کالر چڑھا کر کہا ــ "آج بھی ہم۔ بہ
فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ابھی تک یہاں ایک بھی قتل نہیں ہوا۔ نہ چوری ہوتی ہے۔
اور نہ غنڈہ گردی۔ حالانکہ یہاں کسی چیز پر امتناع نہیں۔ شراب چائے کی طرح پی جاتی
ہے۔ مگر لوگ خود پر قابو رکھنا جانتے ہیں۔

یہاں کے قوانین بڑے سخت ہیں۔ ایک ناریل چُرانے کے عوض (۱۳) سال کی قید
ہوسکتی ہے۔ ایک زمانہ تھا ہم اپنے گھروں کے دروازے بند نہیں کرتے تھے۔ مگر اب۔ ۔ ۔ ۔
کرناٹک سے روزگار کی تلاش میں آنے والوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ گو کہ ایسا کچھ
بھی نہیں ہوا ــ پھر بھی ــ اجنبیوں کو اپنے صحن میں دیکھ کر ایک بے چین سا احساس
تو ہوتا ہی ہے۔"

انہوں نے بات ختم کرکے سانس ٹھنڈی چھوڑی، تو مجھے آج کے ہندوستان کے
بے حساب درد یاد آگئے۔ پھر بھی میں نے اپنا شک سوال کی شکل ان پر داغ ہی دیا۔

"WE LOST NINTY NINE AND ACHIEVED
ONE INDEPENDENCE"

کمال شیخ صاحب نے جواب میں کہا تو مجھے لگا ابھی وہ اس موڈ سے آزاد نہیں ہوئے
ہیں، اس لیے یہ پوچھنا میں نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ کون سے (۹۹) مضمرات ہیں جنہیں کھو کر

(FORMALITY) ورنہ اصل شادی تو ایک دن پہلے ہی رجسٹریشن آفس میں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں رجسٹریشن کے بغیر شادی مکمل نہیں سمجھی جاتی۔،،

میں حیران تو تھی مگر خاموش سنتی رہی۔ وہ پتا نہیں اتنی دیر کہاں تھی کہ یکایک دم سے بیچ میں کود پڑی اور زور سے ہنسنے لگی۔ مسز کمال شیخ دیوانوں کی طرح میری صورت تکنے لگیں۔ میں بڑی شرمندہ ہوئی۔ مگر بے بس تھی۔ کیونکہ اس نابکار سے پیچھا چھڑانا میرے بس میں نہ تھا۔ ،،اب یہ دیکھیں،، اس نے لال مخمل سے ڈھکی ایک سینی مسز شیخ کے ہاتھوں میں تھما دی۔

مسز شیخ ایک کلیدی گڑیا کی طرح سینی لے تو لیں، مگر آگے کیا کرنا چاہیئے جانتی نہ تھیں۔ انہیں حیران دیکھ کر میں نے ہی سینی پر سے سرپوش ہٹایا۔ نیچے ہیرے کی طرح جگ مگ کرتا مصری کا کوزہ رکھا تھا۔ جس میں چاندی کے واق میں لپٹے بادام پستے بھرے تھے۔ مسز صغیرہ شیخ نے بڑی حیران نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے آگے بڑھ کر سارے بادام پستے سینی میں الٹ دیئے۔

،،اسے مصری کا کوزہ کہتے ہیں۔،،

صغیرہ شیخ اسے بڑی چاہت سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگیں۔

،،ہماری تہذیب کے مطابق، شادی سے ایک دن قبل ہمارے یہاں سانچق کی رسم ہوتی ہے۔ دولہا والے، دولھن کے لیے کپڑوں اور دوسری سوغات کے ساتھ ان کوزوں میں خشک میوے بھر کر لاتے ہیں۔ اب آپ اسے بھی کھا سکتی ہیں۔،، ،،اسے توڑ دیں ــــ اتنی نادر چیز ــــ!! ہم اسے سنبھال کر رکھیں گے۔،،

صغیرہ شیخ ایک دم بپھر گئیں۔

،،یہی تو ناممکن ہے۔ وقت کی دھول اس کے جگمگاتے پہلوؤں کو داغدار کر دیگی۔ اور ــــ شاخ نبات اس کی متحمل نہ ہو سکے گی۔،، پھر اس نے اتنی زور کا قہقہہ لگایا کہ ایک چھناکے کی آواز ہوئی ــــ اور، وہ، فضاؤں میں گھل مل گئی۔

بھرتری ہری اُردو میں

ارمغانِ سنسکرت

رگھوناتھ گھئی

(۱)
مناجاتِ شنکر

جن کے ماتھے کا ہے گہنا چودھویں کا ماہتاب
ذکر ہی سے جن کے مِٹ جاتا ہے بدکاری کا نام
اک نظر سے جس کی جل کر مر مٹا تھا کام دیو
ایسی شمعِ نور شوجی کو مرا جھک کر سلام

(۲)
ہوس کی آگ

دربدر کی خاک چھانی، ہر ولایت میں گیا
حرصِ زر میں اپنی عزت آبرو تک بیچ دی
عمر بھر بدخو لیئموں کا رہا خدمت گزار
عمر بھر دل کو ہوس کی آگ تڑپاتی رہی

(۳)
لالچ کا نتیجہ

دور دیسوں میں گیا، ہمراز خویشوں میں رہا
جستجو میں زر کی کھودا کوہساروں کو کبھی
جا کے مرگھٹ میں بھی جپ تپ میں گزارے رات دن
پھر بھی تسکیں مل نہ پائی زر کے ماروں کو کبھی

④ ذلالت

تلخ جملے سن کے بھی خاموش رہ جاتا ہوں مَیں
دِل میں روتا ہوں مگر چہرے سے مُسکاتا ہوں مَیں
یاوہ گویوں سے بھی ہوتا ہوں باعزت ہم کلام
زر کی خاطر ہر ذلالت کو روا پاتا ہوں مَیں

⑤ اگیان

گُل پہ شبنم کی طرح ہے ایک پل یہ زندگی
ایک پل جینے کی خاطر ہر گنہ کرتا رہا
بیچ ڈالا چند ٹکڑوں کے لیے اپنا ضمیر
اور خدا سے بے نیازی کا گِلہ کرتا رہا

⑦ حسرتیں

بے غرض حب تب عقیدت سے ہی ملتی ہے جتنا
ہو صلے کی چاہ تو نیکی میں سبکی کچھ نہیں
فطرتاً مرعوبِ کارِ نیک ہیں دِل کو اگر
تُو ولی ہے تجھ کو جو خواہش صلے کی کچھ نہیں

⑥ صلے کی چاہ

مِٹ چُکے ہیں ہم مگر ہیں حسرتیں دِل میں ابھی
ہے جواں حرص و ہوس گو زندگی کی شام ہے
وقت خود مِٹتا نہیں ہم کو مِٹا دیتا ہے یہ
زندگی اِنسان کی حرص و ہوس کا نام ہے

⑧ لالسا کی آگ

دورِ پیری، لاغری، ناطاقتی، موئے سپید
جھریاں، کمزور بینائی، سماعت ناتواں
دِل میں لیکن کروٹیں لیتی ہیں اب بھی حسرتیں
لالسا کی آگ کی شدت ابھی تک ہے جواں

(۹) گیان کا امرت

گیان کے امرت سے مٹ جاتی ہے دِل کی تشنگی
حرص کا غلبہ وگرنہ کس کو تڑپاتا نہیں
سورگ میں راجہ ہے اِندر دیوتاؤں کا مگر
وہ بھی حِرص و آز کی آتش سے بچ پاتا نہیں

(۱۰) جیون کا موہ

اب کہاں وہ محفلیں، وہ شوق، وہ جام و طعام
دَورِ پیری لاغری ہے جِسم و جاں لاچار ہے
ڈر سے پھر بھی کانپتے ہیں بس کے مرجانے کا نام
آدمی کو اس سڑے جیون سے کتنا پیار ہے۔

(۱۱) آشا نِراشا

رات دن آشا نراشا میں گزاری زِندگی
ہر نئی حرص و ہوس جاں کو جلاتی ہی رہی
ہو رہائی کیوں سکونِ قلب کی کوئی سبیل
بے قراری، ناامیدی دِل دُکھاتی ہی رہی

(۱۲) کامنا چکر

کام کر نیکی کا، ثمرے کا نہ رکھ دِل میں خیال
چاہ ہو ثمرے کی تو نیکی بھلا کس کام کی
کر کے نیکی ڈال دے دریا میں ہوکر بے نیاز
چار سُو پھیلے گی خوشبو خوب تیرے نام کی

(۱۳) زِندگی کی کشاکش

یہ کشاکش زِندگی کی، دہر کی رنگینیاں
چھوڑ دے غافل اِنھیں یہ چار دِن کی بات ہے
تو نہ چھوڑے گا تو آخر چھوڑ دیں گے یہ تجھے
چار دِن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

(۱۴) عیش و عشرت

اہلِ دانش کے لیے آساں ہے ہر کارِ عظیم
عیش و عشرت میں کبھی وہ دل کو اُلجھاتے نہیں
ہم کہ رہتے ہیں سدا بس جستجو میں عیش کی
عُمر بھر کارِ نمایاں کچھ بھی کر پاتے نہیں

(۱۵) پکشی اور انسان

ہم سے بہتر ہیں یہ پنچھی یہ نواسی دشت کے
جوگیوں کی آنکھ کے آنسو جو پیتے ہیں مُدام
ہم کہ رہتے ہیں سدا بدمست کیف و رنگ میں
بیت جاتی ہے ہماری عُمر بے نیل مرام

(۱۶) طمع

ایک گدڑی، جامِ گِل، نانِ جویں، سادا لباس
اِس سے بڑھ کر اور جینے کو بھلا کیا چاہیے
آدمی کی حرص کی لیکن نہیں کچھ انتہا
کس کو ہے معلوم اِس کو اور کیا کیا چاہیے

(۱۷) عورت اور شاعر

پِستان کی گانٹھوں کو کہتے ہیں وہ سونے کے کلس
تھوک بھرے پُر مُنہ کو کہتے ہیں درخشاں ماہتاب
جسم کی بدبو میں اُن کو بوئے مے کی مستیاں
اور پسینے کی کثافت کیف و لُطفِ بے حساب
ہیچ ہے عورت مگر تُف شاعروں کی عقل پر
اِس کے اِک اِک عُضو میں پاتے ہیں حُسنِ لاجواب

(۲۰) جُستجو

زندگی تیری ہے گر حرص و ہوس، جام و طعام
نفس سے آلودہ ہے تو کیا ہے تیری زندگی
کیا کبھی سوچا ہے غافل! زیست کا مقصد ہے کیا
بے روِش، بے مُدعا، یوں ہی گنوا دی زندگی

(۲۳)
پیٹ کی آگ

بھوک کمزوری ہے اِنساں کی نہیں جس سے فرار
بھوک دے کر آدمی کو کردیا زار و نزار
بھوک سے مجبور اِنساں کا نہیں کوئی ضمیر
بھوک سے مجبور اِنساں ہر دلالت کا شکار

(۲۴)
رُسوائی

مانگنا ہی گر ضروری ہے، تو مت اپنوں سے مانگ
ہاتھ مت پھیلا کبھی اپنوں کے در کے سامنے
خاک میں مل جائے گا تیرا وقارِ علم و فن
یہ تجھے رُسوا کریں گے ہر بشر کے سامنے

(۲۵)
بن باس

چھوڑ کر گنگا کی لہروں کا بہ مستانہ خرام
اور ہمالہ کی حسیں، سرمست، دِل کش وادیاں
چھوڑ کر بھرپور میووں سے لدے پیڑوں کے جُھنڈ
گونجتی ہر سُو فضا میں پنچھیوں کی بولیاں
مست جھرنوں کی صدائیں لوریاں گاتی ہوئی
دامنِ کہسار میں پھیلی ہوئی ہریالیاں
کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے چند سکّوں کے لیے
زر کے لالچ میں ذلیل و بےکس و بے خانماں

(۳۰)
صبر و سکون

ہے سکونِ قلب کی دولت اگر حاصل تجھے
دہر کے سامانِ عشرت ہیچ ہیں تیرے لیے
صبر دے کر تجھ کو رازق نے سبھی کچھ دے دیا
قصر و ایواں، مال و دولت ہیچ ہیں تیرے لیے
دے بھی دے تجھ کو ہزاروں گر وہ سونے کے پہاڑ
کچھ نہ ہوگی ان کی وقعت ہیچ ہیں تیرے لیے

(۳۱) مبارک ہیں وہ لوگ

ہیں مبارک دہر میں وہ لوگ جو آزاد ہیں
بے نیازانہ گزر جاتی ہے جن کی زندگی
دکھ نہیں دیتی انھیں خواہش کوئی، حسرت کوئی
بیت جاتی ہے پرستش میں ہی ان کی زندگی

(۲۹) حماقت

اس گپھا میں خود پہ ہنستا ہوں جب آتا ہے خیال
کیا تھی وہ پہلی مری حرص و ہوس کی زندگی
کس قدر بدبخت تھی، محتاج تھی، کتنی حقیر
زر کی خاطر کس قباحت میں گزاری زندگی
اس فقیری میں ہے حاصل مجھ کو شاہوں کا جلال
چار سو پھیلی نظر ہنستی تھرکتی زندگی

(۲۸) جنگل اور شہر

جنگلوں میں ہیں مہیا چار سو رعنائیاں
شیتل جل پینے کو، کھانے کو ہیں پھل میٹھے لذیذ
دوب کا بستر بچھا ہے خوابِ عشرت کے لیے
زندگی آزاد فرحت آشنا و باتمیز
بستیوں میں زر کے لالچ میں بھٹکتی زندگی
کس قدر بے آبرو، بے خانماں، کتنی غلیظ

(۲۷) بستیاں

سوچتا ہوں چھوڑ کر بستی کو بن میں جا بسوں
کیا دھرا ہے بستیوں میں گندگی کے ماسوا
رات دن محنت مشقت مالکوں کی جھڑکیاں
تف ہے اس جینے پہ، اس جینے سے مر جانا بھلا
کس قدر دلچسپ تھی، کتنی جواں تھی زندگی
ہم نے ہی اس کو رہینِ درد و حرماں کر دیا

(۳۱) بھکشا کی فضیلت

تو ہے جوگی، تجھ کو بھکشا مانگنا ذلت نہیں
دل سے لالچ، حرص و نخوت کو مٹا دیتی ہے یہ
ہر گلی ہر گھر میں ماں ہے، ہر بشر اپنا عزیز
پیار کرنے کا انوکھا گُر سکھا دیتی ہے یہ
پیار سے جتنی کوئی دے دے خوشی سے کر قبول
صبر کا احساس پہلو میں جگا دیتی ہے یہ

(۳۲) ڈر سے نجات

زندگی کو موت کا ڈر، لطف کو آزار کا
پیار کو ہجرت کا ڈر، دولت کو ڈر سرکار کا
روپ، یووَن کو بڑھاپے کا لگا رہتا ہے ڈر
نام کو تہمت کا اور شہرت کو ڈر ادبار کا
ایک بیراگی کا دل آزاد ہے ہر خوف سے
اس کو کوئی ڈر نہیں، دھن دھام کا سرکار کا

(۳۳) پوری آزادی

موت کے ڈر سے دبی رہتی ہے ہر دم زندگی
خوفِ پیری سے دبا رہتا ہے سہما سا شباب
حسن کے جلووں سے چکنا چور ہو جاتا ہے دل
ٹوٹ کر نابود ہو جاتا ہے مانندِ حباب
ہو اگر بیراگ تو آزاد ہو جاتا ہے دل
ہے کوئی الجھن نہ بندھن اور نہ کوئی اضطراب

(۳۴) چین کہاں

اِس جہاں کے عیش و عشرت جان و دل کے ہیں وبال
اِن کے لالچ میں جو ڈوبا وہ جیا تو کیا جیا
دہر میں مر مر کے جینے میں نہیں ہے زندگی
روح ہو بے چین تو جینے سے مر جانا بھلا

(۳۵)

برہم کا دھیان

ہیں چھلاوا ایک پل کا دُہر کی رنگینیاں
اِن میں دِل کو مت لگا، دھوکا ہیں یہ دھوکا ہیں یہ
من کے مندر میں بسا لے مورتی بھگوان کی
حُسن کے بُت کچھ نہیں، مایا ہیں یہ مایا ہیں یہ

(۳۶)

دُنیاوی عیش

ایک پل کی بات ہیں یہ دُہر کے عیش و نِشاط
جوں چمک بجلی کی یا جگنو کی جیسے روشنی
یا کمل کے پھُول کی پتّی پہ قطرہ آب کا
ایک پل بیتا تو مِٹ جاتی ہے اِن کی دلکشی

(۳۷)

نُورِ وحدت

عشقِ خوباں، مار و عمرہ، مال و زر، عیش و نِشاط
جان لیوا ہیں یہ سدھن، دل کو اِن سے دُور رکھ
ہے فقط عشقِ حقیقی میں ہر اک دُکھ سے نجات
اپنے دل کو نُورِ وحدت سے سدا معمُور رکھ

(۳۸)

سُکھ کہاں

یاد کر وہ دن رہا جب اپنی ماں کی کوکھ میں
تنگی بس رات دِن دُبکا پڑا سوتا رہا
ہو کے پیدا نوجوانی میں ہوئی تجھ کو نصیب
پھر وہی جا جس میں اپنی جان و دِل کھوتا رہا
حُسن والوں کے سہے طعنے، ہوا بے آبرُو
کس قباحت کے لیے مَرتا رہا، روتا رہا
سوچ تو ناداں ذرا وہ کیا تھا جس کے واسطے
تُند صحراؤں میں بارِ زندگی ڈھوتا رہا

(۳۹)

نراشا کا جیون

تاک میں پیری ہے دَورِ نوجوانی کی حریف
موت کے سائے میں مَر مَر کر گزرتی زِندگی
پھر بھی اِنساں کس قدر غلطاں ہے حِرص و آز میں
بیت جاتی ہے نراشا میں بھٹکتی زِندگی

(۴۰)

یہ کشاکش کس لیے

زندگی بھر کیوں ہوس کی آگ میں جلتے ہیں ہم
ڈھونڈھتے رہتے ہیں ہر دم مال و زر جاہ و جلال
جاتے ہیں اِس کشاکش کی کوئی منزل نہیں
یوں گنوا دیتے ہیں پھر بھی زندگی کے ماہ و سال

(۴۲)

برہم کی مستی

برہم کی مستی سے تیرا دل اگر سرشار ہے
دہر و جنت کی حکومت کچھ نہیں تیرے لیے
کچھ نہیں دنیائے فانی کی کروڑوں مستیاں
اپسراؤں کی بھی وقعت کچھ نہیں تیرے لیے

(۴۳)

موت

بادشہ، قیصر، بہادر، شیر نر عالی وقار
عالم و فاضل، اکابر، نصرتوں کے جوش میں
ہو کے بر مردہ، فسردہ، ٹوٹ جاتے ہیں سبھی
غرق ہو جاتے ہیں یکسر موت کی آغوش میں

(۴۴)

موت ایک کھلاڑی

موت پانسے کا کھلاڑی، کھیل کی گوٹیں ہیں ہم
کعبتیں کا کھیل ہم سے کھیلتا رہتا ہے وہ
یاں سے واں پھر واں سے یاں، یہ سب اسی کی چال ہے
ہم کو یوں ہی چالوں میں اپنی ریلتا رہتا ہے وہ

(۴۵)

گیان

کیا ہے طفلی، نوجوانی، کیا ہے پیری، کیا ممات؟
کیا کبھی سوچے ہیں ناداں! اِن سوالوں کے جواب
رات دن کے چکروں میں یوں بتا دی زندگی
جوں جھپک یا نیم مدہوشی کا اک کھوکلا سا خواب

(۴۶) حرصِ زر

ایک ہی رٹ میں لگا رہتا ہے نِسدن آدمی
گو نئی سج دھج سے آتی ہے ہر اک شام و سحر
بے حیا کھاتا ہے دَر دَر حرصِ زر میں ٹھوکریں
اِس کے دِل پہ کیوں نہیں اِحساسِ ذلّت کا اثر

(۴۷) عشق

ہو حقیقی یا مجازی، عشق آخر عشق ہے
عشق کی مستی سے اپنا دِل سدا مخمور رکھ
کر حسینوں سے محبّت یا خُدا کی ذات سے
یعنی اِس بستی کو جلووں سے سدا معمور رکھ

(۴۸) زِندگی اکارت گئی

سوچ ناداں! اِس جہاں میں آ کے تُو نے کیا کیا؟
کیوں فقط حرص و ہوس میں ہی بِتا دی زِندگی
عشق پریوں سے نہ کوئی معرکہ نے عِلم و فن
کیا ہوئی تیری جوانی، کیوں گنوا دی زِندگی

(۴۹) محرومی

دولتِ عِلم و ہُنر سے بھی رہا محرُوم تو
اور نہ تھا حاصِل حسینوں کا کبھی لُطفِ وَصال
غیر کے رحم و کرم پر ہی رہی تیری نظر
زندگی تیری تھی گویا ایک کوّے کی مثال

(۵۰) وِصالِ مرگ

چل بسے ماں باپ بھی، بھائی بہن بھی، دوست بھی
ذہن میں بس رہ گئیں دُھندلی سی کچھ پرچھائیاں
کٹ رہے ہیں ہم بھی دریا کے کناروں کی طرح
مُنتظِر ہیں اب وَصالِ مرگ کی تنہائیاں

بلراج ورما

ملے سُر میرا تمہارا

ہم اکثر اُن اِمکانات کو موسیقی سے وابستہ کرتے ہیں جن کی بدولت اِنسانوں کے درمیان امن وامان اور قریب آنے کی صورت حال پیدا ہوتی ہے یا جو محض افراد تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ بڑے بڑے گروہوں اور قوموں کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ کچھ اداروں نے موسیقی کی اِس خوبی کا فنِ تعلیم میں بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ موسیقی میں نہ صرف مثبت خوبیاں ہوتی ہیں بلکہ کئی منفی اور انتہائی خطرناک اور تباہ کن خاصیتیں بھی اِس سے وابستہ ہیں۔ اِن خاصیتوں میں قابلِ ذکر ہیں جنگ کے دوران جنگی صلاحیت کو جوش وخروش دلانا یا افراد اور حالات کا ایسی خصوصی تخلیقات کے ذریعے سے مذاق اڑانا جنھیں "پھبتی کے گیت" کہا جاتا ہے۔ اور یہ گیت ایسے ہیں جنھیں افراد اور گروہوں کی پھبتی اڑانے کے لیے تو کیا اُن کی ہتک کرنے کے لیے بھی گایا جاتا ہے۔ لہٰذا اِس میں شک نہیں کہ موسیقی عوام کو سماجی سطح پر ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے جس کا سب سے نمایاں ثبوت ہندوؤں کے مندروں، عیسائیوں کے گرجا گھروں اور سکھوں کے گوردواروں جیسے معبدوں میں اجتماعی نوعیت کے گانے بجانے میں ملتا ہے۔

ہندوستان کے مندروں سے وابستہ موسیقی کے فن، سائنس، جمالیات اور سماجیات کا آغاز اکثر SAMAN CHANTS میں تلاش کیا جاتا ہے جو ویدک کال میں مذہبی تقریبات اور رسومات کا حصہ تھے۔ ڈاکٹر جی۔ ایم۔ تارلیکر نے

SAHAN CHANTS پر اپنی تصنیف میں ان نغموں سے چند بہت ہی مثبت عوامل کو منسوب کیا ہے، جیسے اِنسان اور عناصر کے باہمی اِتحاد کی ضرورت کیوں کہ یہی عناصر ویدک کال میں دیوی، دیوتاؤں کی طرح پوجے جاتے تھے۔ کوئی ڈیڑھ سو سال کے دوران اِس موضوع پر لکھے گئے ماہرین کے کارناموں پر اُن کے تبصرے صرف مختلف موسیقیاتی اور رسوماتی زاویوں پر مبنی ہیں بلکہ تقریباً تمام بڑے ادبی اور سماجی پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ عبرانی، افریقی، مصری، ناردیئی، جاپانی اور بالی جیسے دوسرے تمدنوں کے نغمے بھی اِسی طرح معبودوں کو خوش کرنے کے لیے تیار کیے اور گائے جاتے تھے۔ اِنھیں کی بدولت اُن تہذیبوں کے مذہبی تفکر، فلسفہ اور ثقافت سے وابستہ اقدار کی ماہیت کا ہم پر انکشاف ہوتا ہے۔

کسی مُلک میں وہاں کے فنون کا جو وقار ہوتا ہے اُسی سے درحقیقت اس کی ثقافت اور تہذیب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انگلینڈ کے ممتاز سنگیت کار سر آتھر سلیون نے ایک بار فن کو ایک ایسی دولتِ مشترکہ کہا تھا جس میں فنون کی تمام مملکتوں کا یکساں مرتبہ ہوتا ہے۔ سر آتھر کے الفاظ ہیں:

"میرے خیال میں انسانی جذبات پر موسیقی کا اثر فوری، زیادہ قوی اور آفاقی ہوتا ہے۔"

موسیقی کی طاقت اور اثر کی وضاحت کے لیے بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ اگرچہ بہت سے لوگ اسے ایک گھریلو شغل یا زیادہ سے زیادہ اسے کانوں کے لیے مسرت افزا تفریح سمجھتے ہیں، تاہم درحقیقت یہ اس سے کہیں زیادہ گہری چیز ہے۔ اِس کی وسیع، فوری داد و تحسین اور مقبولیت، اکثر اس کی زیادہ سنجیدہ اور اہم خوبیوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ امن ہو کہ جنگ ہو موسیقی ایک متحرک قوت رہتی ہے۔ کون بھول سکتا ہے بنکم چندر کے "بندے ماترم" اور بسمل کے "سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے" کو جن سے قبل از آزادی دور میں ہمارے محبانِ وطن کے دل و دماغ کھول اٹھتے تھے یا کون بھول سکتا ہے اقبال کے " سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" یا ٹیگور کے " جن گن من " کو جن سے آج ہمارے دلوں میں حب الوطنی کا جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ سُر تال ہمارا ورثہ ہیں۔ جہاں پہلے دو نغمے ہماری تحریک آزادی میں ہمت و حوصلہ افزائی کے آلات کار

تھے وہاں آخری دو نغمے ہمارے یے ایک آزاد جمہوریہ کے شہریوں کی حیثیت سے مایۂ ناز اور حریک کے سرچشمہ ہیں۔ موسیقی میں وہ تمکنت ہے جو الفاظ کے طلسماتی دنیا میں بھی نہیں پائی جاتی۔

ہم نے ملہار اور دیپک وغیرہ جیسے راگوں کے بارے میں سن رکھا ہے جن سے بارش ہو جاتی تھی اور دیپک جل اٹھتے تھے۔ ہم نے ان تجربات کے بارے میں بھی سن رکھا ہے جو جنوبی ہند کے موسیقاروں نے پودوں اور فصلوں کی نشوونما کے سلسلے میں کیے تھے۔ اور دیکھا گیا تھا کہ موسیقی پودوں کے تیزی سے اگنے اور پھلنے پھولنے میں واقعی معاون ثابت ہوئی تھی۔ موسیقی کو اکثر ان خوبیوں کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے جو روحانی یکسوئی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ہم اپنی عبادت موسیقی کے ذریعہ کرتے ہیں اور آج بھی ہم اپنے دیوتاؤں کی تشفی اور تسلی موسیقی ہی سے کرتے ہیں۔ ہم خوشی کے دوران بھی گاتے ہیں اور اداسی کے عالم میں بھی۔ ایسے بھی گیت ہیں جو ہم شادی بیاہ جیسے خوشی کے مواقع پر گاتے ہیں یا ایسے گانے بھی ہیں جو ہم اپنے پیاروں کے مرجانے پر گاتے ہیں۔ ہم جنگ کرتے وقت بھی گاتے ہیں اور جب جنگ جیت لیتے ہیں تو بھی گاتے ہیں۔ فوجوں کی پسپائی کی تقریب کے لیے بھی ہمارے پاس موسیقی کے فن پارے ہیں۔

میں نے ایک پیار کی مختصر سی کہانی کے لیے اس قدر طویل تمہید کیوں پیش کی ہے؟ یہ کہانی مجھے ۱۹۵۶ء میں، نئی دہلی میں منعقد ہوئی یونیسکو جنرل کانفرنس کے دوران پولینڈ کے ایک باشندے نے سنائی تھی۔ مجھے اس کہانی کی سچائی کا پتہ نہیں کیوں کہ میں نے اسے فریڈرک شوپن کے بارے میں کسی کتاب میں لکھا ہوا نہیں پایا۔ میں نے اس کہانی پر یقین کر لیا کیوں کہ مجھے یقین کرنا پسند تھا اور مجھے موسیقی کی اچھوتی قوت کا ذاتی طور سے بھی تجربہ تھا۔ لیجیے یہ کہانی:

پرانے زمانے میں جب موسیقی ایک بادشاہ کی منزلت پر تھی اور شوپن اور اس کے موسیقار ساتھی یورپی سماج کے ممتاز طبقوں پر حکمران تھے تو اس وقت ڈنمارک میں ایک رومن کیتھولک جوڑا رہتا تھا ان کے نام اہم نہیں لیکن ان کی کہانی اہم ہے۔ انھوں نے محبت کی بنا پر شادی کی تھی، اور تقریباً دس سال تک بڑی محبت کے ساتھ مل کر رہے۔ چوں کہ وہ دونوں

جاگیردارانہ خاندانوں سے تھے، جہاں کام کرنے کی ممانعت تھی اس لیے وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی محبت میں ہی مگن رہتے تھے۔

تب اچانک کہیں کوئی واقعہ ہوگیا اور آپس میں محبت کرنے والے ایک دوسرے سے الگ ہوکر گویا دشمن بن گئے۔ ان کا دس سال کا "ہنی مون" ایک تنک یادسی بن کے رہ گیا۔

لوگ نہیں جانتے کہ وہ پیار کیوں کرتے ہیں اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ نفرت کیوں کرتے ہیں۔ محبت اور نفرت کا کوئی معقول تجزیہ نہ کبھی کیا گیا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دس سال پیشتر ان میں محبت ہوگئی تھی، اور محبت کا یہ برعکس یعنی نفرت بھی ان میں اسی طرح ہوگئی۔ جو حد سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہ حد سے زیادہ نفرت بھی کرسکتے ہیں۔ نہ اِس کی کوئی معقول وضاحت ہے نہ اُس کی، کیوں کہ محبت اور نفرت دونوں میں عقلیت کا دخل ممکن نہیں ہوتا۔ وہ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ چونکہ دونوں کے پاس دنیا کی ہر شے کثرت سے موجود تھی لہٰذا وہ ایک دوسرے کے سہارے پر نہیں تھے۔ چونکہ دونوں ابھی جوان تھے اور راہبانہ زندگی ان کے لیے ممکن نہیں تھی اس لیے دوستوں اور بزرگوں نے انھیں طلاق کا مشورہ دیا۔ اس عہد کے رومن کیتھولک خاص کر اس دائرے کے ممتاز لوگ جو اکثر خود روم کے پوپ کے ہاتھوں ہی رشتۂ ازدواج میں پروئے جاتے تھے، اپنے رشتۂ ازدواج کو اس عظیم شخصیت کی اجازت کے بغیر توڑ نہیں سکتے تھے۔

دونوں اپنی خاندانی گاڑیوں میں، قانونی علاحدگی حاصل کرنے کے لیے روم کی جانب چل نکلے۔ وہ "وٹیکان سٹی" میں پہنچے اور مقامی دوستوں کے یہاں قیام کیا انھیں بڑے پروہت نے سماعت دی۔ چونکہ وہ دوستانہ ترغیب اور مذہبی پند و نصائح کے ذریعے انھیں پھر سے ملانے میں ناکام رہے اس لیے اُنھوں نے اُنھیں ایک اور تاریخ پر آنے کو کہا اور بتایا کہ اگر وہ اِس تاریخ تک ایک دوسرے کے قریب نہ آسکے تو وہ انھیں طلاق کی منظوری دے دیں گے۔

دن بڑی تیزی سے گزر گئے۔ مقررہ دن سے ایک دن پیشتر ان کے اپنے اپنے خاندانی دوست انھیں فریڈرک شوپن کا موسیقی پروگرام سنانے کے لیے گئے نہ اُس

آدمی اور نہ عورت کو بھی یہ خیال آیا کہ دوسرا بھی وہاں موجود ہوگا۔ جب سامعین بیٹھ گئے اور اس عظیم موسیقار کی اسٹیج پر آمد کا اظہار کرنے کے لیے روشنیاں کم کر دی گئیں تو انھوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا۔

وہ عورت اپنے احباب سے کہنے لگی:

"مجھے شوپن سے کیا لینا دینا ہے۔ میں ابھی یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ میں اپنی سانسیں اس بداخلاق کی سانسوں میں ملانا گوارا نہیں کر سکتی۔"

وہ آدمی بول اٹھا:

"یہ کمرہ میرے لیے دوزخ کی آگ بن گیا ہے کیونکہ وہ کم بخت بھی اسی میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

وہ اس ہال سے نکل جانے کو تیار تو ہو گئے لیکن دونوں وہاں سے باہر نہ جا سکے کیوں کہ "شوپن کی شب" کی ایک شرط یہ بھی ہوا کرتی تھی کہ جب وہ اسٹیج پر آ جاتے تو ہال کے دروازے مقفل کر دیے جائیں۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا۔ اب نہ کوئی باہر جا سکتا تھا۔ نہ اندر آ سکتا تھا۔

موسیقی کی کارروائی کا آغاز سامعین کے کھڑے ہو کر تعظیم بجا لانے سے ہوا۔ کئی منٹوں تک تالیاں بجتی رہیں۔ آخر میں وہ عظیم موسیقار بولا: "آج میں ایک خاص الخاص نغمہ پیش کر رہا ہوں۔ یہ ایک سمفنی ہے، محبت کا سمفنی۔ جو محبت کرتے ہیں ان کے لیے یہ مسرت کا باعث ہوگا، جنھوں نے محبت کی ہے مگر اب اسے کھو چکے ہیں انھیں اپنے اچھے دنوں کا پھر سے احساس ہوگا اور وہ جس کی بدولت انھیں دنوں کی فضا میں چلے جائیں گے جب وہ مل کر رہتے تھے۔ چونکہ ہم سب زندگی سے محبت کرتے ہیں، لہٰذا میں آج کی پیش کش کو "دنیا کے عاشقوں اور محبوباؤں کے نام منسوب کرتا ہوں۔"

ان الفاظ کے ساتھ وہ ماہر موسیقار پیانو کے پاس اسٹول پر بیٹھ گیا، تمام روشنیاں گل کر دی گئیں صرف پیانو کے اوپر رکھی ہوئی بتی جل رہی تھی تاکہ وہ پیانو بجاتا ہوا دکھائی دیتا رہے۔

موسیقی شروع ہوگئی۔ ہال میں مکمل خاموشی چھاگئی۔ لوگوں نے گویا اپنی سانسیں روک لیں۔ وہ کسی لَے سے بھی بے بہرہ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ وہ ماہر موسیقی کار پیانو بجانے میں محو ہو گیا۔ ایک سرمدی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ جوان اور بزرگ جوڑے، بالکل نہ جانتے ہوئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، اپنے ماضی میں کھوئے ہوئے ایک دوسرے کے ہاتھ دبا رہے تھے۔ وہ مسکرائے بھی نہیں۔ مسکراہٹ کوئی قہقہہ نہیں ہوتی، لیکن انھیں ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے کہیں شاید کوئی ہلکی سی آواز نکل جائے اور کوئی آواز بھی اس وقت ان آوازوں سے زیادہ قابلِ قدر نہیں تھی۔ جو پیانو سے نکل رہی تھیں۔ موسیقار کی لمبی، پتلی انگلیاں پیانو کی کنجیوں پر رقص کناں تھیں جیسے اپسرائیں ناچ رہی ہوں۔ کسی نے فرشتوں کو ساز بجاتے نہیں دیکھا لیکن اب وہ کسی قدر جان گئے تھے کہ فرشتے بھی اس سے بہتر کیا کر سکتے ہیں ـــ یہ صورتِ حال کوئی گھنٹہ بھر ایسے ہی بنی رہی۔

وہ اپنے سمفنی کے آخری الاپ کے قریب ہو چلا تھا کہ ایک ہلکی سی چیخ نے فضا کا سارا طلسم توڑ دیا۔ اس نے پیانو بجانا بند کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ساری روشنیاں جلا دی گئیں اب کسی کو بھی اُس منظر کو دیکھنے میں کوئی دقت نہ تھی۔

ڈنمارک کا وہ جوڑا دھیرے دھیرے چل کر فرش کے وسط تک چلا آیا تھا۔ انھوں نے نہ ایک دوسرے کو چلتے دیکھا، نہ ہی کسی اور نے۔ اب وہ ایک دوسرے سے بڑے تپاک کے ساتھ بغل گیر تھے۔ آدمی کے ہونٹوں نے عورت کے ہونٹوں کو مقفل کر رکھا تھا کسی کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ کسی بھی گہرے جذبے میں الفاظ آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

چیپرج آف روم کا معزز سربراہ معتمد خداوندی کی طرح جانے کہاں سے نمودار ہو گیا ان محبت کے پتلوں کو آشیرواد دینے کے لیے۔" میں ایک بار پھر آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں آج کے بعد تم دونوں ایسے ہی بنے رہو جب تک . . . . " اس نے جملہ مکمل نہیں کیا۔

زندگی اپنے محور پر لوٹ آئی تھی۔ شوبن اسٹیج کے وسط آ کھڑا ہوا

تھا۔ اِس پر بار بار دادِ تحسین کی بوچھاڑ کی گئی۔ تالیوں کی ایک گونج تھی جو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ کھڑے کھڑے تعظیم کا یہ سلسلہ کئی منٹوں تک جاری رہا۔ شوپن کی چمکتی آنکھوں سے پگھلے موتی جھڑ رہے تھے۔ اسے اس مقدس سربراہ نے اِس جوڑے کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا تھا۔ اُسے لگا گویا اُسے اپنا انعام مِل گیا ہو۔

(پیارے قاری! کیا یہ کہانی آپ کو یقین نہیں دلاتی کہ اِنسانی جذبات پر موسیقی کا سب سے قوی، آفاقی اور فوری اثر ہوتا ہے۔)